عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

طلوعِ اسلام

جون ۱۹۴۲ء

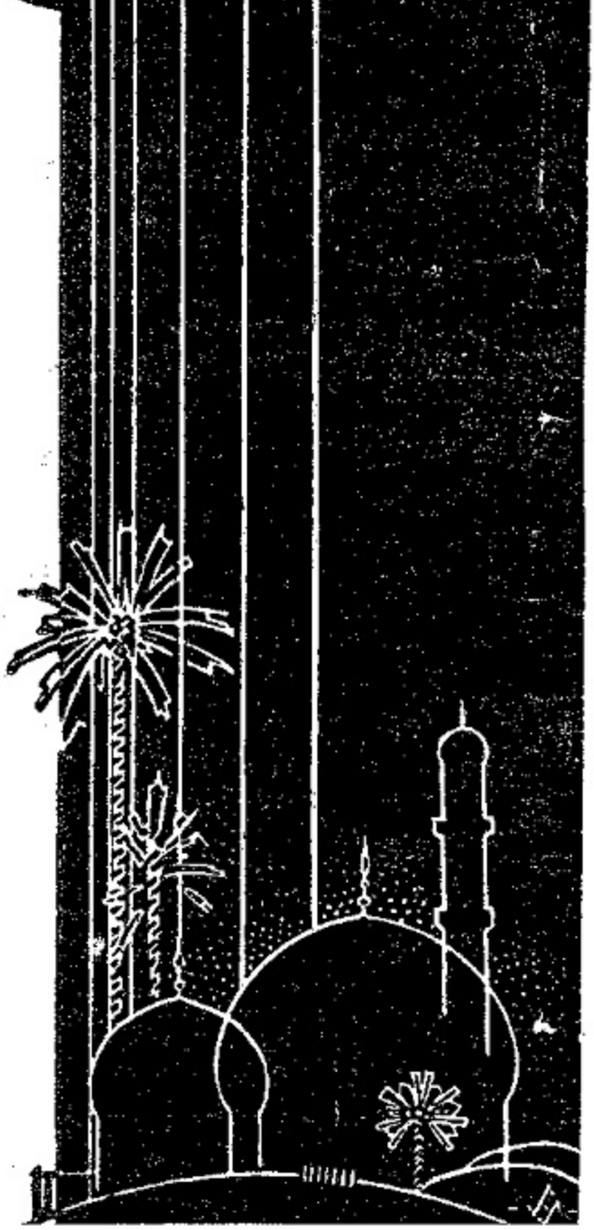

بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا

ماہوار مجلہ

طلوع اسلام

دہلی

دور جدید

مرتب	بدل اشتراک	
اخوندزادہ حسین امام		پانچروپیہ سالانہ
	ششماہی	تین روپے
جلد (۵) شمارہ (۶)	قیمت فی پرچہ	آٹھ آنے ۸/

جمادی الاولیٰ ۱۳۶۱ھ مطابق جون ۱۹۴۲ء

فہرست مضامین

لمعات	ادارہ	۱۲
مقصود	جناب اسد ملتانی	۱۳
نقد و نظر	ادارہ	۱۴-۱۶
حدیث کے متعلق میرا مسلک	جناب چودہری غلام احمد صاحب پرویز	۱۷-۲۴
باب المراسلات	....	۲۵-۳۹
سوال	جناب سید الطاف حسین صاحب۔ ایم۔ اے۔ اے۔ ٹی۔ ایس۔ جہانسی	۴۰
اقبال۔ شخصیت اور پیام	؟	۴۱-۴۸
متحدہ قومیت اور مسلمان لیڈران	جناب عبدالوحید خاں صاحب بی۔ اے۔ لکھنؤ	۴۹-۵۸
حقائق و عبر	ادارہ	۵۹-۶۵

اے خوش آں منعم کہ چوں درویش زیست
در چنیں عصرے خدا اندیش زیست

دنیا میں یوں تو موت ہر ایک کے لئے ہے لیکن بعض موتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ ان کی یاد پوری قوم کے لئے آہ جگر دوز اور اشکِ لالہ گوں کو ساتھ لئے آتی ہے سیٹھ حاجی عبداللہ ہارون کی موت ایک ایسی ہی موت ہے۔

دور سے دیکھنے والوں نے مرنے والے کو ایک بہت بڑا سوداگر۔ فن تجارت کا ماہر۔ اسمبلی کا ممبر اور زیادہ سے زیادہ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا رکن ہی دیکھا۔ لیکن جنھیں قریب سے دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی تھی انھوں نے مرحوم کو اس سے کچھ الگ دیکھا۔ انھوں نے دیکھا کہ وہ ایک سراپا قلب تھا درد سے لبریز۔ عشق کا شعلۂ بیدار تھا ہمہ تن سوز۔ دولت کے انبار میں ایک فقیر۔ اس کی زندگی کا ایک ہی نصب العین تھا اور اس کے سر میں ایک ہی سودا۔ وہ نصب العین تھا حکومت الٰہیہ کا قیام جسے وہ بھی عام اصطلاح میں پاکستان ہی کہتا تھا۔ لیکن اس کا پاکستان عام سیاسی تصورات سے بہت آگے تھا اسے اپنے نصب العین سے عشق تھا۔ اور اس کے حصول کا محکم یقین۔ زندگی کے آخری دنوں پاکستان کے سوا اور کوئی تذکرہ اس کے لئے خوش آیند نہ تھا اس کے لئے اس کے ذہن میں کیا کیا تجاویز اور کیسے کیسے نقشے تھے۔ یہ وہی جانتے ہیں جنھوں نے اسے قریب سے دیکھا۔ صاف گو۔ کشادہ ظرف۔ سیر چشم۔ خلوص اور محبت کا ایک ابلتا ہوا چشمہ۔ سادہ دل۔ سادہ مزاج۔ وفا شعار سپاہی۔ قابلِ اعتماد دوست۔

مرنے والے! تیرے غم میں پوری ملّتِ اسلامیہ سوگوار اور ملت کا قائد اعظم اشکبار ہے۔ اللہ تعالےٰ تجھے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو تیرا!
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو تیرا!

لمعات

آسمان کی آنکھ نے ہبوطِ آدم سے لیکر اس وقت تک سطحِ ارض پر لاکھوں انقلابات دیکھے۔ عبرت انگیز۔ دیدہ کشا۔ حیرت زا۔ ابھرتی ہوئی قوموں کو دیکھا۔ الٹتی ہوتی سلطنتوں کو دیکھا۔ چمکتی ہوئی تہذیبوں کو دیکھا۔ مٹتے ہوئے تمدنوں کو دیکھا۔ ثریا رس محلات کو دیکھا۔ پھر ان کے کھنڈرات کو دیکھا۔ ریت کے تودوں کو لالہ زار بنتے اور شگفتہ و شاداب گلکدوں کو ویرانوں میں تبدیل ہوتے دیکھا۔ کہیں راکھ کے ڈھیر کے نیچے خوابیدہ چنگاریوں کو شعلۂ بیدار بنتے اور کہیں تڑپتی ہوئی بجلیوں کو راکھ کے ڈھیر میں منتقل ہوتے دیکھا۔ یہ سب تماشے فی الحقیقت حیرت انگیز اور عبرت آمیز تھے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ جو کچھ مسلمانوں پر (بلکہ صحیح الفاظ میں اسلام پر) بیتی چشمِ فلک نے اس سے بڑا حیرت انگیز انقلاب شاید ہی کہیں اور دیکھا ہو۔ تفصیل میں الجھے بغیر ذرا تصور میں لائیے اس منظر کو کہ شہر کی عظیم الشان مسجد کے منبر پر امام کھڑا ہے اور قرآن و حدیث۔ تاریخ و آثار کے حوالے دیکر بتا رہا ہے کہ صدرِ اول کے مسلمانوں نے کس قدر لرزہ انگیز جہاد کئے۔ کن کن میدانوں کو اپنے خونِ شہادت سے لالہ زار بنایا۔ غیر اللہ کی ہر قوت کو مٹانے کے لئے کتنی کتنی بڑی قربانیاں دیں۔ اور تو اور۔ خود اس ذاتِ گرامی صفات ﷺ نے جس کی نظیر آسمان کی آنکھ نے نہ پہلے دیکھی اور نہ بعد میں دیکھنے کا امکان ہے۔ کتنے غزوات کا بنفسِ نفیس انصرام فرمایا۔ کتنے جیوش و عساکر کی قیادت فرمائی۔ کتنے زخم کھائے۔ کتنا مقدس خون بہایا۔ اور یوں کس قدر جانفروشانہ قربانیوں کے بعد دنیا میں دین کو متمکن اور قرآن کے احکام کو عملاً نافذ فرمایا۔ وہ کبھی جوش انگیز لہجہ اور کبھی رقت آمیز انداز میں ان واقعات کو بیان کرتا ہے۔ خود بھی روتا ہے اور سننے والوں کو بھی رلاتا ہے اور اس کے بعد —— اور اس کے بعد نماز کی دو رکعتیں ادا کرکے وانصرنا علی القوم الکٰفرین ○ کی دعا مانگ کر اپنے حجرہ میں چلا جاتا ہے اور سننے والے اپنے اپنے کاروبار میں مصروف ہو جاتے ہیں اور سب کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ دین کی طرف سے جو فریضہ ان پر عائد ہوتا تھا وہ بجمدہ ادا ہو گیا۔ وہ لرزہ انگیز اور رقت آمیز کوائف وہ واقعات جو ابھی بیان

ہوئے تھے وہ صرف اس لئے تھے کہ گرمیٔ محفل کے لئے بطورِ داستان سرائی بیان کر دئے جائیں زبان سے اقرار (ایمان) یہ ہے کہ قرآن کے احکام کی تعمیل ہر مومن پر فرض۔ سنت نبویؐ کی اطاعت واجب اور عملاً یہ حالت کہ قرآن کے احکام اور ان احکامات کی عملی شکل کے واقعات محض قصہ پارینہ جن کا ان سے گویا کچھ تعلق ہی نہیں۔ بحث و جدل میں دیکھئے تو بچا بچا کر جواب کہ مسلمان کے لئے چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی سنت نبویؐ کی خلاف ورزی جائز نہیں۔ یہ سب بجا اور درست۔ لیکن سنت نبوی کی اتباع فقط آمین بالجہر اور رفع یدین تک رہ گئی۔ باقی رہیں تمکین دین (قیام حکومت الٰہیہ) کے لئے وہ تمام سرفروشی و جاں سپاری کی اہم سنن جو کتب روایات میں تابندہ موتیوں کی طرح جگمگا رہی ہیں وہ سب معاذ اللہ قصے کہانیاں ہیں۔ قرآن کی تلاوت "ثواب" کی غرض سے۔ والسارق و السارقۃ فاقطعوا ایدیھما (اور جو چور ہو خواہ مرد ہو یا عورت۔ تو اس کے ہاتھ کاٹ ڈالو) محض اس لئے ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ کے پڑھنے سے دس دس نیکیاں ملتی ہیں۔ یہ بحث کہ ہاتھ کہنیوں تک کاٹنے چاہئیں یا پہنچے تک۔ صرف اس لئے ہے کہ طالب علم تک "صحیح روایت" پہنچ جائے۔ اس سے آگے کچھ غرض نہیں کہ اس آیت کی تعمیل کس طرح ہوگی اور ان روایات کی اتباع کی کونسی شکل ہے! جب ان سے مفہوم ہی ثواب ٹھہرا تو اس خار دار جھاڑی تک پہونچنے کی ضرورت کیا کہ یہ ایک حکم ہے منجانب اللہ جس کی تعمیل فریضہ ہے۔ جب اس کی تلاوت سے جنت مل جاتی ہو تو پھر اور "دردسری" کیوں مول لیجائے۔ یہ حکم تھا رسول اللہ کے لئے۔ انھوں نے اس پر عمل کر کے دکھادیا۔ اب ہمارا فریضہ یہ ہے کہ اس آیت کو تلاوت کے ذریعے سے محفوظ رکھیں اور اس سے متعلقہ روایات کو جرح و تعدیل کی بحثوں سے کھنگال کر اس کے جزو دین ہونے پر ایمان رکھیں۔ اس سے خدا اور خدا کا رسول خوش ہوگا اور اس کی جزا جنت ہوگی۔ بحث کو زیادہ بڑھائیے تو اس نقطہ تک پہونچ جائیے کہ یہ احکام اُسی زمانہ میں نافذ العمل ہونگے جب مسلمانوں کا **امام** اپنا ہوگا۔ اور جب پوچھئے کہ صاحب! مسلمانوں کا اپنا امام کب ہوگا تو اس کے لئے قربِ قیامت کا وقت بتادیا جائے گا اگر کوئی یہ کہدے کہ صاحب! میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ احکام ہر وقت نافذ العمل ہونے کے لئے ہیں۔ اگر آج ہم میں ان کی تنفیذ و ترویج کی قوت نہیں تو اس کے معنے اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہمارا **اسلام** وہ اسلام نہیں جسے نبی اکرمؐ نے متشکل فرما کر دکھایا تھا۔ تو چاروں طرف سے دہائی مچ جائے گی کہ دیکھنا اس

ملحد زندیق کی نہ سننا۔ یہ مادہ پرست ہے۔ اس کی ذہنیت افرنگ زدہ ہے یہ یورپ کی مادی ترقی سے متاثر ہو چکا ہے۔ اس کے نزدیک مذہب کے لئے دنیاوی قوت و شوکت ضروری ہے حالانکہ مذہب کا مقصود "روحانی ترقی" ہے۔ آخرت کی نجات ہے۔ ایسا کہنے والے پر کفر کے فتوے چسپاں ہونگے اس کی تخریب و تذلیل میں ہر ممکن کوشش "جہاد عظیم" قرار دی جائے گی اس پر مصیبت آئے گی تو مسرت کے شادیانے بجیں گے کہ بہت اچھا ہوا یہ فتنہ یوں کچلا گیا۔ اور اگر کہیں انسانی ہمدردی کی بنا پر دوسروں کی دیکھا دیکھی۔ اس کی اس مصیبت میں مدد کرنے کا سوال پیدا ہوگا تو اسے اس شرط سے مشروط کر دیا جائے گا کہ اس سے کہیئے کہ پہلے اپنے "مردود عقائد" سے تائب ہو جائے اور وعدہ کرے کہ اس کے بعد اس قسم کے الحاد کا فتنہ مسلمانوں میں کبھی نہیں پھیلائے گا۔

کہیئے کہ آسمان کی آنکھ نے اس سے زیادہ عبرت انگیز اور اس سے بڑھ کر حیرت زا انقلاب کوئی اور بھی دیکھا ہے! خدائے قدوس کے فرشتے جنھوں نے اسلام کی اُس عالمگیر سطوت و شوکت کو دیکھا اور آج مسلمانوں کی ہمہ گیر سرنگونی اور کس مپرسی کو دیکھ رہے ہیں۔ اس پر گواہ ہیں کہ چشم فلک نے اس سے بڑا انقلاب کہیں نہیں دیکھا۔

اس منظر کو ذرا اور آگے بڑھایئے۔ ریگ زار ہند میں منزل فراموش کردہ منتشر قافلے کے افراد کے سامنے ایک مخلص للہ کے بندے نے صحیح اسلامی نصب العین رکھا یعنی ان کی اکثریت کے علاقہ میں ان کی اپنی آزاد حکومت جہاں شریعتِ خداوندی کے مطابق انھیں اپنی نشو و ارتقاء کا موقعہ مل سکے۔ ایک مخلص بندے نے یہ نصب العین دیا اور دوسرے بندے نے اسے اپنے خداداد تدبر و فراست اور ایثار و خلوص کی بنا پر آگے بڑھایا۔ حالت یہاں تک پہونچ گئی کہ سخت ترین مخالف جماعت (کانگریس) کے ایک نہایت ذمہ دار رکن (مسٹر راجگوپال آچاریہ) نے ملکی مفاد کلی کے پیش نظر اس نصب العین کی معقولیت کا اعتراف کیا اور اس حقیقت کو اپنی جماعت کے سامنے علانیہ پیش کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہاں آسمان کی آنکھ نے کیا دیکھا؟ دیکھا یہ کہ ایک متشدد ہندو اس مطالبے کی حمایت کر رہا ہے اور اس مطالبے کی حمایت کو اس قدر مبنی بر صداقت سمجھتا ہے کہ وہ جماعت کی مجلس عاملہ سے الگ ہو جانے کو بھی گوارا کر لیتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس سب سے بڑی مخالفت اس کی

طرف سے ہوتی ہے جو کبھی مسلمانوں میں امام الہند۔ سرخیل گروہِ علماء اور اپنے جوشِ کلام و انداز تحریر کی بنا پر ابوالکلام اور قلم کا بادشاہ کہلاتا تھا! اور وہ مخالفت بھی کسی ملکی مفاد پر نہیں کرتا بلکہ کہتا یہ ہے کہ "پاکستان کا نظریہ اسلام کے خلاف ہے"۔ اللہ اکبر! کفر و اسلام کے امتزاج سے ایک متحدہ قومیت کا افسانوی تخیل عین اسلام۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک سے ایسی حکومت کا قیام جس میں انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین نافذ ہوں (اور انسانوں میں بھی اکثریت غیر مسلموں کی) یہ عین اسلام اور مسلمانوں کی اپنی آزاد حکومت جس میں شریعتِ خداوندی کا نفاذ ہو۔ یکسر اسلام کے خلاف۔ چشم بصیرت کے لئے یہ انقلاب کوئی چھوٹا انقلاب نہیں، اس تاسف انگیز واقعہ سے مسلمانوں کے دلوں میں غم و غصہ کی لہر کا دوڑ جانا فطری امر ہے جب تک کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے۔ اس کی طرف سے ایسی کھلی ہوئی غداری ناقابلِ برداشت صدمہ ہے لیکن ہم مسلمانوں سے پوچھتے ہیں کہ وہ بھی ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر سوچیں کہ انھوں نے ایسے لوگوں کی روٹی کا کوئی انتظام کر رکھا ہے جن کا ذریعہ معاش کچھ نہ ہو اور وہ اپنا وقت اجتماعی کاموں میں صرف کر دیں! مسلمان تو جناح جیسا لیڈر چاہتے ہیں جو ان کا کام بھی کرے اور اپنی گرہ سے کھلائے بھی۔ لیکن ہر شخص جناح تو نہیں ہو سکتا! ہمیں یقین ہے کہ اگر مسلمانوں نے اپنے ہاں اس قسم کا انتظام کیا ہوتا تو بہت سے لوگ جو آج غیروں کے کیمپ میں نظر آتے ہیں کبھی اپنوں سے الگ نہ ہوتے۔ یہ قوم کی بدبختی ہے۔ باقی رہا ان لوگوں کا اپنے مسلک کو برسرِ حق ثابت کرنے کی کوشش کرنا۔ سو ایسا کون ہے جو اس کا اقرار کرے کہ اس نے مجبوری اور بیچارگی سے فلاں مسلک اختیار کر رکھا ہے اور عام لوگوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ بھوک اور پیاس برداشت کر لینگے لیکن صداقت کی راہ نہ چھوڑینگے۔ تو یہ بہت بڑی سعادت ہے جو ہر ایک کے حصے میں نہیں آیا کرتی یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف خود جناب آزاد صاحب کو بھی ہے سنئے کہ وہ اس کا اعتراف کن الفاظ میں کرتے ہیں:۔

> سالکِ راہِ حریت و صداقت کے پاؤں میں اس کے دشمن لوہے کی زنجیریں ڈال دیتے ہیں تاکہ وہ آئندہ کے منازل طے نہ کر سکے۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ زنجیر لوہے کی جگہ سونے کی ہوتی ہے، وہ اس طلسمی زنجیر کو دیکھ کر راہ و رسمِ منزل صداقت پرستی سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اس کی طرف دوڑ جاتا ہے اور مسکراتا ہوا خود دشمن کے ہاتھ

سے لیکر اپنے پاؤں میں ڈال لیتا ہے۔ یہ طلسمی زنجیر کیا ہے؟ امید زر اور طمع جاہ!
لیکن آہ! کس قدر دنی الوجود کم ظرف ہے وہ انسان جو صرف حبِّ مال اور الفت زر کے لئے خدا کی محبت کو ٹھکرا دیتا ہے اور ایک فانی شے کے لئے حق و صداقت کی باقی لازوال دولت کو ہمیشہ کے لئے کھو دیتا ہے۔ وہ چاندی سونے کے سکوں کو اگر خدا کے لئے اور اس کی سچائی کے لئے کھو دے تو خدا اسے سچائی کے ساتھ واپس دلا سکتا ہے پر جو خدا کی محبّت کو دولت کے لئے کھوتا ہے وہ تو اسے دولت نہیں دلا سکتی پھر انسانیت کے لئے کیسی دردانگیز موت ہے کہ انسان آسمان کی سب سے بڑی عزت کو زمین کی سب سے بڑی ذلّت کے لئے کھو دے؟

کتنے بڑے بڑے تاجدار پر ہیبت فاتح، عظیم الشان سپہ سالار نامور محبِّ وطن اور محبوب القلوب و ملّت پرست انسان ہیں جن کی حق پرستانہ عزائم کی استقامت کو اسی لعنتِ طمع نے ڈگمگا دیا، انھوں نے اپنے ملک اپنی قوم، اپنی فوج اور دراصل اپنے خدا اور اس کی صداقت سے غداری کی اور دشمنوں کے لئے دوستوں کو، غیروں کے لئے اپنوں کو، ظالموں کے لئے مظلوموں کو۔ بے رحم فاتحوں کے لئے بیکس مفتوحوں کو اور شیطان کے تخت کی زیب و زینت کے لئے خدائے رحمٰن کے دربارِ اجلال کی عزت و عظمت کو چھوڑ دیا! تاریخ کے صفحات ہمیشہ سے اسی درد کے ماتمی ہیں۔ قوموں اور ملکوں کی داستانیں ہمیشہ ناپاک سرگذشت پر خون کے آنسو بہاتی ہیں اور دولت پرستی کی ملعون نسل آغازِ عالم سے ناصیۂ انسانیت کے لئے سب سے بڑا بے عزتی کا داغ رہی ہے فی الحقیقت راہ حق پرستی کی سب سے بڑی آزمائش چاندی اور سونے کی سرخی ہی ہے اور اگر اس منزل پر خطر سے تم گذر گئے تو پھر تمہاری ہمت بے پروا اور تمہارا عزم ہمیشہ کے لئے بے خوف ہے یہی طمع کا خبیث دیو ہے جس کا پنجہ بڑا ہی زبردست اور جس کی پکڑ قلبِ انسانی کے لئے بڑی ہی مضبوط ہوتی ہے اسی نے فرزندانِ ملّت سے غیروں کے آگے عجزی کرائی ہے۔ یہی پکڑ پکڑ کے ابنائے وطن کو لے گیا ہے اور غیروں کے قدموں پر اخلاق کی ناپاکی اور جذبات کی کثافت کے کیچڑ

میں گرادیا ہے، تاکہ اپنے وطن، اپنی سرزمین، اپنے مذہب، اپنی قوم اور اپنے بھائیوں کے خلاف جاسوسی کریں! اسی نے بڑے بڑے مدعیانِ خدمت ملک و ملت کی برسوں کی کمائی ایک آن کے اندر ضائع کردی ہے اور انھیں چارپایوں کی طرح گرادیا ہے تاکہ برسوں کی سچائی کو ایک لمحہ کی طمع پر قربان کردیں۔ آہ! یہی انسانیت کے لئے وہ روحِ خبیث ہے جو بڑے بڑے پاک جسموں، بڑی بڑی مقدس صورتوں، بڑے بڑے پراز علم و عمل دلوں کے اندر حلول کرگئی ہے اور فرشتہ سیرتوں نے شیطانوں کے، اور ملکوتی صفات ہستیوں نے خونخوار عفریتوں کے سے کام کئے ہیں۔

(مضامین آزاد حصہ سوم)

مسٹر راجگوپال اچاریہ کی اس تحریک سے کم از کم ایک فائدہ تو ضرور ہوا معلوم ہوتا ہے کہ مسلم قومیت پرست حضرات کی اکثریت کانگریس کی مسلم کش پالیسی سے دل ہی دل میں بیزار ہو چکی تھی لیکن یہ لوگ اپنی ناک رکھنے کی خاطر اس سے الگ نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن موقعہ کی تلاش میں ضرور تھے مسٹر اچاریہ کی جرأت نے یہ موقعہ بہم پہونچادیا۔ ان میں سے کئی ایک نے تو ان کی کھلم کھلا حمایت کی بہت سے غیر جانبدار رہے اور اب باقیوں کی طرف سے آئے دن ان کی تائید میں بیانات شائع ہوتے رہتے ہیں بعض واضح اور غیر مبہم بعض کچھ ملمعی قسم کے۔ لیکن ہر ایک ان کی قلبی کیفیت کا غماز۔ سوشلسٹ مسلمان پنجاب صوبہ کانگریس کا صدر۔ احرار آزاد مسلم بورڈ کے سکریٹری۔ سرحد کے قومیت پرست حتکہ خود سرحدی گاندھی صاحب۔ ہر ایک کسی نہ کسی رنگ میں تائید کر رہے ہیں۔ اور یوں اس حقیقت کا اعتراف کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کا اپنی آزاد حکومت کا مطالبہ حق بجانب ہے۔ بعض اوقات حق کی تائید کے لئے کیسے کیسے عجیب سامان پیدا ہو جاتے ہیں!

لیکن مسٹر راجگوپال اچاریہ یا ان کے دیگر ہمنوا حضرات کی اس تائید کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے ہمارے مطالبے کا حق بجانب ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ہمارا مطالبہ۔ بلکہ یوں کہیئے کہ نصب العین تو پہلے دن سے حق پر مبنی ہے۔ اور حق حق ہی ہوتا ہے خواہ اس کی تائید کرنے والا کوئی بھی نہ ہو۔ اس لئے مسٹر اچاریہ کی تائید و حمایت ہمارے لئے باعث فخر و ناز نہیں۔ بلکہ یہ چیز خود ان کے لئے وجہ افتخار

ہے کہ انھیں حق وصداقت کی حمایت میں جرأت و بیباکی کی توفیق نصیب ہوئی۔ البتہ اس سے ہم خوش ضرور ہیں کہ ایک شخص باطل کی ضد کو چھوڑ کر صداقت کے اعتراف کی راہ پر آگیا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے اطمینان کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ سر سٹیفورڈ کرپس نے دبی زبان سے ہمارے مطالبے کو درخورِ التفات تسلیم کر لیا یا اب چند کانگریسی حضرات نے اس کی صداقت کا اعتراف کر لیا؟ کیا اس کے بعد اب ہمارے ذمہ اور کچھ باقی نہ رہا؟ کیا اب ہمارا مقصود خود بخود پکے ہوئے پھل کی طرح ہماری جھولی میں آگرے گا! کیا اب ہماری طرف سے یہ کانگریسی حضرات ہمارے مخالفین سے نبرد آزما ہو کر ہمارا مطالبہ منوا دیں گے؟ اگر مسلمان یہی سمجھ رہا ہے تو وہ اپنے آپ کو فریب دے رہا ہے اور جتنی جلدی وہ اس خود فریبی کو چھوڑ کر حقیقت آشنا ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے **پاکستان** نہ کسی **کرپس** کی تائید سے حاصل ہوگا نہ کسی اچاریہ کی حمایت سے۔ یہ حاصل ہوگا قوم کی اجتماعی قوت اور ایثار سے۔ اور یہ وہ راز ہے جسے مسلمان ابھی تک کما حقہ سمجھا نہیں۔ زندگی کا فلسفہ کیا ہے؟ اسے حضرت علامہ اقبالؒ نے دو مصرعوں میں اس جامعیت اور خوبصورتی سے بیان فرمایا ہے کہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ وہ فرماتے ہیں ؎

زندگی انجمن آرا و نگہدار خود است

ایکہ در قافلۂ۔ بے ہمہ شو۔ باہمہ رو

انفرادی حفاظت کا جذبہ ہر حیوان میں پایا جاتا ہے۔ آپ ایک چیونٹی کو بھی پکڑنے یا مارنے کی کوشش کریں گے تو وہ بھی اپنے تحفظ کے لئے امکان بھر قوت صرف کرے گی اس لئے اگر انسان صرف اپنی انفرادی حفاظت ہی کی فکر کرتا ہے تو یہ تو محض تقاضائے حیوانیت ہے۔ اس کی انسانی زندگی اس سے آگے جا کر شروع ہوتی ہے اور وہ زندگی یہ ہے کہ اپنے انفرادی استحکام کے ساتھ ساتھ اجتماعی استحکام و تحفظ کی بھی فکر کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ انسانی زندگی اجتماعیت کی زندگی ہے۔ اسے حیوانوں کی طرح الگ الگ نہیں بلکہ آپس میں مل جل کر رہنا ہے اس لئے ایک فرد کی حفاظت جماعت کی حفاظت پر مبنی ہے۔ قافلہ کے ہر فرد کے لئے مضبوط و تنومند ہونا نہایت ضروری ہے۔ یہ انفرادی خودی کا استحکام "بے ہمہ شو" کی زندگی ہے لیکن یہی مقصود نہیں۔ مقصود یہ ہے کہ اس انفرادی استحکام کے

ساتھ۔ تمام قافلہ کی حفاظت کی بھی فکر کیجائے۔ یہ حصہ "باہمہ رو" کی زندگی پر مشتمل ہے اگر بغور دیکھا جائے تو قافلے کی حفاظت درحقیقت افراد کی ہی حفاظت ہے "قافلہ" نام ہی افراد کے مجموعے کا ہے۔ لیکن جب تک قافلے کا ہر فرد۔ اپنی ذاتی حفاظت کے ساتھ قافلے کے اجتماعی تحفظ کی فکر نہ کرے گا اس کی انفرادی حفاظت ناممکن ہے۔ قافلے کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ افراد اپنی انفرادیت کو قافلہ کی اجتماعیت میں گم کردے۔ امیر کارواں کی اطاعت۔ جماعتی ربط وضبط کی پابندی۔ فرائض متعلقہ کی سرانجام دہی۔ ایثار۔ جرأت۔ شجاعت یہ تمام جوہر قافلے کی حفاظت کے لئے ضروری ہیں۔ ذرا غور کیجئے اسپین میں مسلمانوں نے قریب تین سو سال حکومت کی اور اس شان و شوکت سے حکومت کی کہ آج تک اس کی یاد باقی ہے۔ لیکن آج اسی اسپین میں ایک مسلمان باقی نہیں ہے۔ زندہ مسلمان تو ایک طرف کسی قبر تک کا نشان باقی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جب وہاں کے مسلمانوں پر ہلاکت و بربادی کے طوفان امڈے ہیں تو انفرادی طور پر ہر شخص نے اپنی اپنی حفاظت کا سامان کیا ہوگا (اس لئے کہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے یہ تو تقاضائے فطرت ہو چکی ہے) لیکن اس کے باوجود وہ سب مٹ گئے یہ کیوں ہوا؟ اس لئے کہ انھوں نے انفرادی حفاظت کی کوشش کی قافلے کی حفاظت کی فکر نہ کی۔ اگر وہ افراد مل کر کارواں کی حفاظت کی تدبیر کرتے تو اسپین پر آج بھی انہی کی حکومت ہوتی۔

ہندوستان کے مسلمان کے سر پر بھی اس قسم کے ادبار کے بادل منڈلا رہے ہیں اور وائے بدبختی کہ یہاں بھی ہر شخص اپنے انفرادی تحفظ کی فکر میں ہے **قافلہ** کی حفاظت کا خیال ہی دل میں نہیں آتا ظاہر ہے کہ حفاظت کی ان انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہلاکت کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔ لیکن اگر یہی انفرادی کوششیں ایک **کارواں** (اجتماعی) شکل اختیار کرلیں تو ہر فرد محفوظ رہے گا۔ مثلاً مسلمانوں میں ہزاروں دولتمند ایسے ہیں جو اپنے خزائن و دفائن کی حفاظت کے لئے پاسبان ملازم رکھ رہے ہیں۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ یہ پاسبان ان کی کوئی حفاظت نہیں کرسکتے لیکن اگر یہی حضرات۔ زیادہ نہیں تو اپنے پاسبانوں کا خرچ **امینِ ملت** کی خدمت میں پیش کردیں تو وہ نہ صرف ان کے خزائن و دفائن کی حفاظت کا سامان مہیا کردے گا۔ بلکہ ان کی جان۔ عزت آبرو عفت و عصمت سب کچھ محفوظ رہ سکے گا۔ اس لئے اس سے پورے کا پورا قافلہ محفوظ ہو جائے گا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اتنی سی آسان بات بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی تنظیم ہنوز بیحد کمزور ہے۔ لوگوں نے مسلم لیگ کو "اوروں" کی جماعت سمجھ رکھا ہے۔ مسٹر جناح نے اگلے دنوں قومی بیت المال کے لئے جو اپیل شائع کی ہے اس کے نتائج روح افزا ہیں لیکن نہایت حوصلہ شکن ہیں روح افزا اس لئے کہ قوم کے غریبوں نے اس میں اس وقت تک پونے دو لاکھ روپیہ جمع کر دیا ہے لیکن حوصلہ شکنی اس لئے کہ امرا کا طبقہ بالکل بے تعلق بیٹھا ہے۔ حالانکہ یہی وہ طبقہ ہے جسے سب سے زیادہ حفاظت کی ضرورت ہے ہمارے پاس ملی خدام کی کوئی جماعت موجود نہیں۔ خاکساروں کی تباہی پر ہر چشم عبرت خونابہ فشاں ہے۔ لیکن عسکریت کے بغیر کسی قافلہ کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ ہم نے آئین شکنی کی کبھی تائید نہیں کی۔ نہ ہی اب آئین شکنی کی کسی روش کے مؤید ہیں۔ سنا ہے کہ علامہ مشرقی سے اب نقل و حرکت کی پابندیاں دور ہونے والی ہیں خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ مشرقی بڑے جوہروں کا مالک ہے قوم کو چاہیئے کہ اپنی پوری قوت ان جوہروں سے مستفید ہونے میں صرف کر دے۔ مشرقی کی تنظیم مسلم لیگ کا میمنہ اور میسرہ بن سکتی ہے یہ وہ قوت ہوگی جس سے دنیا کے کسی شریف انسان کو خائف ہونے کی ضرورت نہیں مسلمان کی قوت تو ہر ضعیف و ناتواں کے سپر ہوتی ہے اور وہ از روئے قرآن امور ہے کہ اپنے دشمن سے بھی انصاف کرے اس لئے مسلمان کی قوت میں ڈر کاہے کا یہ تو خدا کا سپاہی اور دنیا میں نیکی کا محافظ ہے۔ اس وقت سب سے اہم چیز قائداعظم کی اپیل کے جواب میں جلد از جلد سرمایہ کی فراہمی اور نہایت پرامن طریق سے اجتماعی حفاظت کے لئے ملت کی عسکری تنظیم ہے وقت وہ نہیں کہ اسے لفظی ریزولیشنوں اور بحث مباحثوں میں صرف کیا جائے ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے

اس لئے اب تو کچھ کرنے کا وقت ہے۔ اب ــــ اور اگر اب نہ ہوا تو پھر یہ موقع کبھی ہاتھ نہ آئیگا۔

سندھ کی سیاست۔ اسلامی ہند (بالخصوص پاکستانی) سیاست میں جتنی اہمیت رکھتی ہے باہر کی دنیا اتنی ہی اس سے ناواقف ہے۔ وہاں کوئی ایسا اسلامی اخبار نہ تھا جو سندھی مسلمانوں کے سامنے صحیح اسلامی سیاست کو پیش کرتا اور باہر کے مسلمانوں کو وہاں کے احوال و کوائف سے آگاہ

آگاہ کرنا۔ پارسال گذشتہ ہمارے محترم سید علی محمد راشدی صاحب نے ہمت کی اور ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار (مسلم وائس) جاری کر دیا۔ راشدی صاحب اسلامی دنیا۔ بالخصوص مسلم لیگ کے حلقہ میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اللہ تعالٰی نے انھیں حسن تدبر کے ساتھ عمدہ قلم بھی عطا فرمایا ہے۔ اس ایک سال میں مسلم وائس نے اپنے مقصد پیش نظر کو نہایت عمدگی سے سرانجام دیا ہے۔ لیکن اس منشور سے جو راشدی صاحب نے شائع کیا ہے یہ دیکھ کر بیحد رنج ہوا کہ اس اخبار کو سال بھر میں دو ہزار روپیہ کا نقصان اٹھانا پڑا۔ راشدی صاحب نے اپیل کی ہے کہ انھیں اگر اتنی حضرات ایسے مل جائیں جو ۲۵ روپیہ سالانہ (علاوہ زرچندہ) بطور عطیہ عنایت فرما دیں تو اخبار اپنے مشن کو آگے بڑھاتا جائے گا ورنہ اس گراں سالی میں اس قدر خسارہ برداشت کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ ہم ہندوستان بھر کے ارباب خیر سے بزور درخواست کریں گے کہ وہ راشدی صاحب کی اس اپیل پر لبیک کہیں۔ مسلم وائس کا زندہ رہنا پاکستانی سیاست کے لئے نہایت ضروری ہے بڑھنے اور اسے زندہ رکھنے میں امداد فرمائیے۔ پتہ یہ ہوگا مدیر مسلم وائس۔ رام باغ روڈ۔ کراچی

در سینہ تا بچند بر آرم فسردہ دم!
این ہم قطرہ خوں کہ ز مژگاں چکیدنی است

طلوع اسلام کا سابقہ پرچہ اپریل و مئی کی مشترکہ اشاعت تھی اس سے ایک غرض یہ بھی تھی کہ ہمیں ایک ماہ کی فرصت مل جائے گی کہ ہم ان ناساعد حالات پر قابو پانے کی کوشش کریں جو جنگ کی وجہ سے گراں باری کا باعث بنتے چلے جارہے ہیں ہمیں توقع تو تھی کہ ہماری کوشش بارآور ہوگی لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا حالات کی ناساعدت اس حد تک پہونچ چکی ہے کہ اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ کچھ وقت کے لئے طلوع اسلام کی اشاعت ملتوی کر دی جائے۔ لکھنے کو تو ہم یہ چار الفاظ لکھ ہی گئے ہیں لیکن اس سے ہمارے دل پر کیا قیامت گذری ہے اس کا اندازہ ہم ہی لگا سکتے ہیں ہمیں اس کا بھی خوب احساس ہے کہ اس فیصلے سے ان احباب کے دل پر کیا گذرے گی جن کی کیفیت یہ ہے کہ اگر کبھی رسالہ دو چار دن کی تاخیر سے شائع ہوا ہے تو ان کی بیتابی تمنا استفسارات کے خطوط سے چھلک پڑی ہے ان کے لئے ساعدت حالات تک طلوع اسلام کی غیر حاضری یقیناً

جگر پاش ہوگی۔ لیکن ہم درخواست کریں گے کہ ہماری مجبوریوں پر نگاہ رکھتے ہوئے ہماری معذرت قبول فرمادیں۔ ہمیں اس کا احساس ہے کہ اس وقت جو حالات رونما ہو رہے ہیں ان کے پیش نظر بالخصوص طلوع اسلام کی اشاعت میں التوا نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن ہم کیا عرض کریں کہ آسمان سے کتنے عرصہ کی مسلسل لڑائی کے بعد ہمیں سپر انداز ہونا پڑا ہے۔

بہرحال ایک مجبوری ہے جس میں ہم اور آپ سب شریک ہیں۔ طلوع اسلام نے اپنے معاملات میں ہمیشہ خدا کو درمیان میں رکھا ہے اور (سوائے کسی نادانستہ غلطی کے) آج تک حسن معاملہ کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ اب مجبوراً اس کی اشاعت ملتوی کرنی پڑی ہے ہم حسن معاملہ کو پھر ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتے۔ آپ حضرات کا بقایا زرچندہ (ایک ماہ کا ہو یا سال بھر کا) ہمارے پاس امانتہً محفوظ رکھا ہے جو حضرات چاہیں وہ ہمیں ایک کارڈ لکھدیں (جس میں نمبر خریداری ضرور درج ہو) بقایا زرچندہ بلاتامل واپس کر دیا جائے گا۔ اسے اچھی طرح سے سمجھ لیجئے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ اس بقایا کے بدلے طلوع اسلام کا شائع کردہ لٹریچر خرید لیں یا سابقہ پرچے جو آپ کو مطلوب ہوں منگالیں (ان کی فہرست الگ دیجاتی ہے) لیکن اس کے لئے آپ مجبور نہیں ہیں آپ بلاتکلف اپنا بقایا واپس منگا لیجئے۔ ہمیں اس کی خوشی ہوگی۔ ہم تیقن یہ نہیں کہہ سکتے کہ طلوع اسلام دوبارہ کب حاضر خدمت ہوگا اس لئے آپ کسی قسم کی غلط فہمی میں نہ رہیئے اور اپنے فیصلے سے ہمیں ۱۵ اپریل تک مطلع فرمائیے تاکہ ہم چاہتے ہیں کہ آخر تک ان معاملات کا فیصلہ کر سکیں

معارف القرآن کے لئے اب جناب مؤلف (چودھری غلام احمد صاحب پرویز) بمکان ۵ نورجہاں روڈ نئی دہلی کے پتہ پر لکھئے تو بہتر ہوگا۔

سردست یہ آخری سطور ہیں جو احباب کے چشم منتظر کے سامنے حاضر ہیں یہ سطور روشنائی سے نہیں بلکہ خونِ دل سے لکھی جارہی ہیں۔ چار برس کی مسلسل ملاقاتوں کے بعد یہ خلاء ایک ایسی کمی پیدا کر رہا ہے جس کے تصور سے آنکھوں میں آنسو جھلک آتے ہیں۔ اس چار برس میں ہم نے جو کچھ کیا صرف اللہ کے لئے کیا کسی اور جذبہ کے ماتحت کچھ کہنا ہمارے نزدیک شرک کے مرادف ہے۔ اس میں جو کچھ صحیح اور درست تھا وہ قرآن کریم کے تصدق میں تھا۔ جو کچھ غلط تھا۔ اس کی ذمہ دار ہم خود ہیں اس کے لئے ہم بحضور رب العزت دست بدعا ہیں کہ وہ ہماری ان نادانستہ غلطیوں کو معاف کرے۔ آپ احباب سے بھی معذرت خواہ ہوں کہ ہماری طرف سے جو کچھ کوتاہیاں اور سہل انگاریاں ہوگئی ہوں۔ اس سے معاف فرمادیں۔ خدا حافظ!

سنہ فائل کے آخری صفحہ پر

"مقصود"

خود زیاں میری نظر میں سود بنکر رہ گیا
اشکِ حسرت گوہرِ مقصود بنکر رہ گیا

درد کا مقصد تو تھا دل میں بڑھی سوزِ حیات
میں سراپا قلبِ غم فرسود بنکر رہ گیا

جب مٹا سوزِ محبت زندگی کس کام کی
شعلۂ دل پیچ و تابِ دود بنکر رہ گیا

آہ بدبختی، حصولِ مدعا کا ولولہ
انتظار طالعِ مسعود بنکر رہ گیا

کاش یہ اِک دن بھڑک اُٹھتا شرارِ عشق سے
کچھ نہیں گر جوشِ دل بارود بنکر رہ گیا

خاکبازی نے گھٹا دی شمعِ دل کی روشنی
ذہن فانوسِ غبار آلود بنکر رہ گیا

کیا غرض بابِ حریمِ ناز وا ہو یا نہ ہو
جبکہ سنگِ آستانِ مسجود بنکر رہ گیا

کامیابی کا کیا جو بھی ذریعہ اختیار!
وائے ناکامی، وہی مقصود بنکر رہ گیا

(اسد ملتانی)

نقد و نظر

ذیل کی پہلی تین کتابیں کتابستان پوسٹ بکس ۳۱۶۴ بمبئی ۳ کی طرف سے شائع ہوئی ہیں۔ کاغذ۔ لکھائی چھپائی عمدہ بلا جلد

(۱) جواہر العلوم علامہ طنطاوی جوہری مصری کی مشہور عربی کتاب کا ترجمہ (مترجم جناب پروفیسر عبدالرحیم صاحب اسلامیہ کالج پشاور)۔ علامہ طنطاوی کی یہ کتاب اس قابل ہے کہ اسے ہمارے عربی مدارس کے نصاب میں شامل کیا جائے تاکہ انھیں کچھ تو معلوم ہو سکے کہ دنیا کیا ہے؟ اس کتاب میں قرآن کریم کی آیات کی روشنی میں اشیائے فطرت کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ہر چند ان لوگوں کے لئے جن کے سامنے علوم سائنس ہر انگریزی کی کتابوں میں ہیں انکے لئے اس کتاب کی معلومات اوسط سے زیادہ نہیں لیکن ہمارے قدامت پسند طبقہ کے لئے جو پانچسو برس پہلے کی دنیا میں رہتے ہیں اس میں بہت کچھ ہے ترجمہ صاف ہے قیمت فی جلد دو روپئے ضخامت ۲۱۹ صفحات۔

(۲) محمد رسول اللہ کارلائل کے "ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ" میں ایک باب نبی اکرمؐ کی سیرت کبریٰ کے متعلق بھی ہے۔ زیر نظر کتاب اسی کا ترجمہ ہے (مترجم جناب عبدالرحمان عاقل رحمانی) ترجمہ صاف ہے مغرب کی غیر مسلم مصنف حضورؐ کی مدح و ستائش میں کتنا ہی کچھ لکھیں لیکن ان کی نگاہ مقام نبوت سے شناسا نہیں ہو سکتی اس لئے ایسی کتابوں کا محض ترجمہ شائع کرنا مفید نہیں ہو سکتا۔ وہ زیادہ سے نبی کو "ہیرو" کا ہی درجہ دے سکتا ہے اس سے آگے اس کی نگاہ جا ہی نہیں سکتی۔ قیمت آٹھ آنے۔ چھوٹی تقطیع ۹۳ صفحات

(۳) شانِ خدا مؤلفہ جناب عبدالرحمان صاحب عاقل رحمانی وجود باری تعالےٰ کے ثبوت کے متعلق عقلی دلائل جو جدید و قدیم فلاسفہ کے غور و تدبر کا نتیجہ ہیں جو لوگ خدا کی ہستی کے دل سے قائل ہیں انھیں ذہنی دلائل کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اور جو اس سے منکر ہوتے ہیں وہ عام طور پر اپنے افکار کی تائید میں یورپ کے اتنے ہی بڑے بڑے فلاسفہ کے اقوال و آرا بحث و جدل میں پیش کر دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ہستی باری تعالےٰ کے متعلق گفتگو کرنے

کرنے لئے صرف قرآنی اسلوب اختیار کرنے چاہئیں اس کتاب میں کچھ چیزیں قرآن سے بھی لی گئی ہیں لیکن وہ اصل بحث کے لئے کافی نہیں۔ چھوٹی تقطیع ۷۵، صفحات قیمت ایک روپیہ

---

(۴) پیامِ حریت

جناب محمد ظفر احمد صاحب انصاری ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی کی وہ نظم جو
مسلم نادار پھر جذبِ حمیت لے کے اٹھ!
کے انداز پر ولولہ انگیز ہے انصاری صاحب کے خیالات میں پاکیزگی اور اسلوب بیان میں جوش اور سلاست ہے نظم اچھے کاغذ پر خوبصورت چھپی ہے مہدی علی خان تاجر کتب چوک الہ آباد سے دو آنہ فی نسخہ کی قیمت پر مل سکتی ہے۔

تصحیح

سابقہ اشاعت میں صفحہ ۹ پر حضرت علامہ اقبال رح کے متعلق جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں غلطی سے ۲۱ اپریل کی جگہ ۱۹ اپریل لکھا گیا ہے اس کی تصحیح فرما دیجئے۔

اس مضمون میں حضرت علامہ رح کے اکثر اشعار کا انتخاب جناب عرشی امرتسری کے وقت نظر کا نتیجہ تھا جو رسالہ البیان میں شائع ہوئے تھے۔ اس کے لئے ہم عرشی صاحب کے شکر گزار ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

دورِ حاضرہ کی عظیم الشّان کتاب

"مُعارفُ القرآن"

(از جناب چودھری غلام احمدؐ صاحب پرویز)

یعنی حقائق قرآنی کا دائرۃ المعارف۔ جو اس اصول پر مرتب کیا گیا ہے کہ قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے اور تکمیل شرف انسانیت کے لئے مکمّل اور واحد ضابطۂ حیات ہے۔

اس کی ترتیب

کے متعلق یوں سمجھئے کہ قرآن کریم سے متعلق کوئی مسئلہ آپ کے ذہن میں آئے۔ پوری کی پوری قرآنی تعلیم ایک دلکش۔ مربوط مضمون کی صورت میں آپ کے سامنے ہو۔

جلد اوّل

شائع ہو چکی ہے۔ بڑی تقطیع ۲۹×۲۲ کے ۵۷۶ صفحات پر مشتمل۔ کاغذ۔ کتابت۔ طباعت۔ جلد اعلیٰ درجہ کی قیمت

بلا جلد ——— پانچ روپیہ ۵/ ——— محصول ڈاک ۱۲/

مجلّد ——— ساڑھے چھ روپیہ ——— محصول ڈاک ۱۴/

کتاب کا مقدمہ علّامہ اسلم جیراجپوری مدظلہٗ کے تبحر علمی کا آئینہ دار ہے۔ جس میں علم تفسیر پر بالخصوص محققانہ بحث کی گئی ہے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام دہلی

حدیث کے متعلق میرا مسلک

(پرویز)

ذرا بڑھاپے اور جوانی کے مزاج کے اختلاف پر نظر ڈالئے۔ جوانی میں جن امور پر سنجیدگی سے غور کیا جاتا ہے اور شگفتہ جبینی سے ان کے متعلق کسی فیصلہ تک پہنچا جاتا ہے۔ بڑھاپے میں وہی باتیں باعثِ اشتعال اور وجہ برافروختگی ہو جاتی ہیں۔ جوانی اور بڑھاپے کے زمانہ میں پھر بھی ایک لمبا فاصلہ ہوتا ہے۔ ذرا تندرستی اور بیماری کے زمانہ کے مزاج پر غور کیجئے۔ تندرستی میں قوتِ برداشت بہت زیادہ ہوتی ہے لیکن بیمار کا مزاج کچھ ایسا چڑچڑا، ضدی اور زود رنج ہو جاتا ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بگڑ بیٹھتا ہے۔ کوئی بات ذرا مرضی کے خلاف ہوئی اور اسے غصہ آیا، کوئی چیز ذرا طبع نازک پر ناگوار گذری اور وہ آتش در پیرہن ہو گیا۔ بالعموم اچھے اچھے بھاری بھرکم اور سنجیدہ مزاج لوگوں کا بیماری کے زمانہ میں سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔

بڑھاپے اور بیماری میں ہوتا کیا ہے؟ یہی کہ اعصاب میں قوت نہیں رہتی۔ ذرا سا اختلاف طبیعت میں انتشار پیدا کر دیتا ہے، تھوڑی سی ناموافقت سارے نظامِ عصبی کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ اچھا بھلا انسان چھوئی موئی بن کے رہ جاتا ہے وَمَن نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ أَفَلَا يَعْقِلُونَ ۝

افراد کی طرح اقوام کے مزاج کا بھی یہی عالم ہے۔ قومیں اپنے عروج و سطوت کے زمانہ میں شباب کی سی کوہ مثال ہمتوں کی مالک ہوتی ہیں۔ ایک تندرست انسان کی طرح ان کا مزاج کمال اعتدال پر ہوتا ہے۔ ان کے نظامِ عصبی میں اس قدر استحکام ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا صدمہ (چہ جائیکہ اختلاف) اس میں کسی قسم کا انتشار پیدا نہیں کر سکتا۔ ان میں اختلافات بھی ہوتے ہیں اور باہمی تصادمِ فکر و آرا بھی لیکن وہ اس تضاد و تخالف کو نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں۔ وہ اختلافی امور پر یونہی برہم نہیں ہو جاتے بلکہ متانت اور سنجیدگی سے اُن پر غور کرتے اور عزم و استقلال سے کسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ چونکہ ان کے سامنے ایک عظیم الشان نصب العین حیات ہوتا ہے جس کے حصول کی خاطر وہ مستانہ وار آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ فرعی اختلافات کسی مقام پر بھی ان کی راہ میں عنان گیر نہیں ہوتے

برعکس اس کے وہی قوم جب نکبت و زوال کے عذاب الٰہی میں گرفتار ہو جاتی ہے تو اس پر بڑھاپے اور بیماری کی تمام خرابیاں مسلط ہو جاتی ہیں۔ اس کے قوائے ملی میں اضمحلال اور اجتماعی نظام عصبی میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے۔ ان میں نہ کسی مسئلہ پر سنجیدگی سے غور و فکر کی قوت باقی رہتی ہے نہ نظم و ضبط سے کسی فیصلہ پر پہنچنے کی طاقت۔ وہ (غلط یا صحیح) جن خیالات کو اپنے ذہن میں راسخ کر لیتی ہے ان کے خلاف ایک لفظ سننا بھی گوارا نہیں کرتی۔ ان کے قومی مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ زندگی کا کوئی بلند نصب العین ان کے سامنے نہیں ہوتا۔ چھوٹے چھوٹے اختلافات کی خار دار جھاڑیاں قدم قدم پر ان کا دامن الجھا لیتی ہیں جسے وہ صبر و تحمل سے چھڑانے کے بجائے زود رنجی اور شعلہ مزاجی سے جھٹکا دیکر الگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن سے دامن کی دھجیاں اڑ جاتی ہیں۔ وہ ایک پیر کہن سال کی طرح جس کے قویٰ میں ضعف و اضمحلال پیدا ہو چکا ہو۔ اختلافات کو ہمیشہ مخالفت پر محمول کرتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ منہ میں جھاگ آ جاتی ہے۔ اور آستینیں چڑھا کر آمادۂ پیکار ہو جاتے ہیں۔ اور اگر کچھ نہ بن پڑے تو جیسا کہ عام طور پر کمزوری میں ہوتا ہے۔ گالیوں پر اتر آتے ہیں۔ زوال پذیر قوم کی یہی حالت ہوتی ہے۔ اور مشکل بالائے مشکل یہ کہ بیمار اور بڈھے کی طرح یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ اپنا اعتدال کھو کر کس درجہ ضبط و تحمل سے عاری ہو چکے ہیں۔

مسلمان صدیوں سے سوگوار شباب ہے۔ عروج و اقبال گیا۔ بڑھنے اور پھولنے کے دن گئے۔ جوانی گئی۔ بڑھاپے کا ضعف و اضمحلال رگ و ریشہ پر طاری ہو گیا۔ صحت گئی۔ اور بیماری کے اثرات تمام نظام عصبی کو مفلوج کر گئے۔ کہولت اور علالت کے وہ تمام آزار جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ ایک ایک کر کے قوم کے ہر گوشۂ حیات پر مسلط ہو گئے۔ سنجیدگی سے سمجھنے اور سوچنے کی ہمت گئی۔ ضبط و نظم اور صبر و تحمل گیا۔ اختلاف برداشت کرنے کی طاقت سلب ہو گئی۔ جو کچھ ذہن میں سما گیا اس پر اڑ کر بیٹھ گئے ہیں۔ اس کے خلاف ایک لفظ کہنے والا بدترین دشمن تصور کیا جاتا ہے۔ قویٰ میں اضمحلال۔ خیالات میں انتشار۔ قلب و نظر میں پریشانی۔ شعلہ مزاجی۔ زود رنجی۔ طبیعت میں چڑچڑاپن۔ بات بات پر تکفیر و تفسیق کی سب و شتم۔ عبرت کی آنکھ جوانی اور بڑھاپے کے اس فرق کو دیکھتی ہے اور دل کا خون تاسف کے آنسو بن کر آستین کو لالہ زار بنا دیتا ہے۔ ذرا آج کسی سے کہئے کہ فلاں مسلمان یہ نہیں مانتا کہ رسول اکرمؐ اپنے جسد مبارک کے ساتھ معراج میں تشریف لے گئے تھے۔ پھر دیکھئے کہ چاروں طرف سے اس پر کس کس انداز سے سب و شتم کی بوچھار ہوتی ہے اور اس کے لئے کیسے کیسے لیبل تراشے جاتے ہیں

اور اس ہنگامہ میں کوئی اتنا نہیں سوچتا کہ خود صحابہ کبارؓ میں ایسے حضرات موجود تھے جو معراج بالجسد کے قائل نہیں تھے۔ لیکن بایں ہمہ کسی نے ان کے خلاف ایک لفظ تک نہیں کہا، اس لئے کہ وہ صحت و شباب کا زمانہ تھا۔ اور اب بیماری اور بڑھاپے کے اضمحلال کا وقت ہے جب برداشت کی سب قوتیں جواب دے چکی ہیں۔

پھر ایک مصیبت یہ بھی ہوتی ہے کہ بعض بد فطرت طبائع جن کی سرشت میں فتنہ پردازی اور فساد انگیزی کے جراثیم پرورش پاتے رہتے ہیں۔ عوام کی اس شعلہ مزاجی اور زود رنجی سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔ اور یہ لوگ طرح طرح کی غلط بیانیوں سے عوام کے جذبات کو مشتعل کرتے رہتے ہیں تاکہ قوم میں تشتت و افتراق کی ہلاکت آفریں خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جائے۔ اور ملت کی توجہ کسی مفید کام کی طرف مرکوز نہ ہونے پائے۔

جو حضرات میرے خیالات کا مطالعہ فرماتے چلے آرہے ہیں ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ میری دعوت، دعوت الی القرآن اور میری پکار خدائے حیّ و قیوم کی اس زندہ و پائندہ کتاب کی طرف لوٹنے کی پکار ہے۔ میں محض "بہ طریق ظنّ" نہیں کہتا۔ بلکہ علیٰ وجہ البصیرت اس ایمان و ایقان کی رو سے کہتا ہوں جس کا سرچشمہ قلب کی انتہائی گہرائیاں ہیں۔ کہ ملت اسلامیہ کی بازآفرینی کی ایک اور صرف ایک ہی راہ ہے کہ وہ قرآن کریم کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں۔ میں قرآن کی روشنی میں دیکھ رہا ہوں کہ ہمارا موجودہ مذہب ایک بڑی حد تک غیر قرآنی عناصر سے ترکیب پا چکا ہے۔ اور اسلامی عناصر کی ترتیب بھی الٹ چکی ہے۔ ان غیر اسلامی عناصر کو الگ کرنے اور مختلف عناصر کی ترتیب کو از سر نو درست کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ مذہب کے ہر عنصر کو قرآنی روشنی میں پرکھا جائے اور ہر شے کو اپنے اصلی مقام پر رکھا جائے۔ میں جانتا ہوں کہ قوم کو ضعف و اضمحلال کے زمانے میں اس کے راسخ کیش و مسلک سے الگ ہٹنے کی دعوت کس قدر پر خطر روش ہے۔ اور اس کے برعکس قوم کے معتقدات کی رو کے ساتھ ساتھ بہے جانے میں کس قدر منافع ہیں۔ لیکن یہ نفس کی پکار ہے اور وہ قرآن کی دعوت۔ میں اس سعادت پر اس رب ذوالمنن کی بارگاہ صمدیت میں قدم قدم پر سجدہ ریز ہوں کہ اس نے مجھے قرآن کی دعوت پر لبیک کہنے کی توفیق عنایت فرمائی۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ میری آواز دراصل ایک درماندہ راہی کی صدائے دردناک ہے جو ایک لٹے ہوئے قافلہ کے منتشر افراد کو ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دیتی ہے۔ جیسا کہ ابھی ابھی لکھا

جا چکا ہے۔ میرے نزدیک رد و کشمکش سے بچنے کی ایک ہی سبیل ہے اور وہ یہ کہ مذہب میں ہر شے کو اس کے اپنے اصل مقام پر رکھا جائے۔ اس ضمن میں میں نے کچھ عرصہ ہوا اس حقیقت کو واضح کیا تھا کہ اسلام میں قرآن، حدیث اور فقہ کی صحیح صحیح پوزیشن کیا ہے۔ بات بالکل واضح تھی۔ لیکن چونکہ۔ جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے۔ قوم میں برداشت کی قوت نہیں رہی اس لئے بجائے اس کے کہ اس پر سنجیدگی اور متانت سے ٹھنڈے دل سے غور کیا جاتا۔ برہمگی اور برافروختگی نے غلبہ پالیا۔ اور اصل حقیقت ہنگامہ خیزی کے تلاطم میں گم ہو گئی۔ فتنہ پرداز طبائع نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا۔ اور ادھر ادھر کی غلط بیانیوں سے عوام کے مشتعل جذبات کو اور بھی بھڑکانے کی کوشش کی تاکہ قوم کہیں قرآن کے مرکز پر جمع نہ ہو جائے۔ اس وقت تک اس موضوع پر مختلف گوشوں سے جو کچھ شائع ہوتا رہا ہے (خواہ وہ مخلصانہ غلط فہمی کی بناء پر تھا یا معاندانہ افتراء پردازی کی بناء پر) میں نے اسے نہایت غور سے دیکھا ہے۔ اور اتنے عرصہ کے مزید تفکر و تدبر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ قرآنی روشنی میں میں نے جو کچھ سمجھا ہے۔ بحمد اللہ وہ درست ہے۔ اور (بجز مفسدہ طبقہ کے) جو حضرات اس مسلک کی مخالفت کر رہے ہیں درحقیقت وہ بھی اس کے موافق ہیں۔ بظاہر یہ چیز متضاد سی نظر آتی ہے۔ لیکن اس باب میں جو کچھ طلوع اسلام میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہا ہے وہ بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ چونکہ اس باب میں غلط فہمیاں زیادہ پیدا کی گئی ہیں۔ اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ایک بار پھر کھلے کھلے اور واضح الفاظ میں اپنے مسلک کی تشریح کر دوں تاکہ کوئی صاحب محض غلط فہمی کی بناء پر حقیقت سے دور نہ رہیں۔ ذرا غور سے سنئے کہ میں کیا کہتا ہوں۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْ إِلَّا بِاللّٰهِ

میں یہ سمجھتا ہوں کہ۔

(۱) اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے اپنے ہاں سے دین عطا فرماتا ہے۔ دین اس ضابطۂ اطاعت کا نام ہے جو ایک مردِ مومن کی زندگی کے ہر گوشہ پر حاوی ہے۔ اس ضابطہ کی رو سے کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے اپنی اطاعت کرانے کا حق نہیں رکھتا۔ عبودیت کی سزاوار صرف خدا کی **ذات** ہے۔

(۲) انسانوں کو دین، رسولوں کی وساطت سے ملتا ہے۔ خدا کا آخری دین جو مکمل اور محفوظ شکل میں قرآن کریم کے اندر موجود ہے حضور خاتم النبیینؐ کے ذریعے دنیا کو ملا جو قیامت تک کیلئے نافذ العمل رہیگا۔

(۳) مسلمانوں کے ایک فرقہ نے جسے منکرین حدیث یا چکڑالوی کہا جاتا ہے۔ **رسولؐ** کے منصب کی تعیین میں

بہت بڑی غلطی کھائی ان کے نزدیک منصب رسالت صرف پیغام کا پہنچانا ہے اور بس۔ یعنی ان کے عقیدے کے رو سے رسول کی حیثیت (معاذ اللہ) ایک چٹھی رساں کی سی ہے جس کا فریضہ چٹھی کو مکتوب الیہ تک پہنچا دینا ہے۔

(۴) دین سے مقصود چند نظری معتقدات کو انفرادی طور پر مان لینا ہی نہیں بلکہ اس سے مفہوم یہ ہے کہ خدا کے ضابطۂ قوانین کو عملی طور پر دنیا میں نافذ اور رائج کیا جائے اسی کا نام حکومت الٰہیہ کا قیام ہے۔ رسول کا کام ابلاغ رسالت کے بعد حکومت الٰہیہ کا قیام بھی ہے۔ وہ سب سے پہلے دین کو عملی شکل میں رائج کرتے ہیں اور یوں دنیا کو محسوس طور پر بتاتے ہیں کہ دین سے منشائے خداوندی کیا ہے اس کا نام منصب امامت ہے۔ یعنی رسول اس امامت کبریٰ کی رو سے ملت کا مرکز اور لنگر ہوتا ہے۔ اس مرکز کے حکم کی اطاعت خدا کی اطاعت ہوتی ہے۔ اسی کا نام خدا اور رسول کی اطاعت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کا دین انسانوں تک پہنچایا۔ اور اس کے ساتھ ہی اسے عملی طور تشکل کر کے دکھا دیا کہ دین کے تمکن فی الارض سے مفہوم کیا ہے۔ دین کے تمکن یا حکومت الٰہیہ کے قیام کا یہ بہترین نمونہ تھا جس کی پیروی میں دین کو آگے منتقل ہونا تھا۔

(۵) نبی اکرمؐ کی تشریف برآری کے بعد امامتِ امت یا مرکزیتِ ملت خلیفۃ الرسول امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ذات میں منتقل ہو گئی اس نصب امامت نے یہ بتا دیا کہ رسول کے بعد (جو امر من اللہ ہوتا ہے) امامت کا قیام کس طرح سے ہوتا ہے اب خدا اور رسول کی اطاعت اس مرکز ملت کی اطاعت تھی اور اس کے حکم اور فیصلوں سے سرتابی خدا اور رسول کی معصیت۔ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں خدا اور رسول کی اطاعت دو الگ الگ چیزیں نہ تھیں اسی طرح اب خلیفۃ الرسول کے زمانے میں خدا، رسول اور خلیفۃ الرسول کی اطاعت تین جداگانہ چیزیں نہ تھیں۔ بلکہ اس مرکز کا فیصلہ خدا اور رسول کی اطاعت تھا۔

(۶) قرآن کریم میں بجز چند تصریحی احکام کے دین کے اصولی قوانین بیان کئے گئے ہیں مرکز ملت کا کام یہ ہے کہ ان اصولی احکام کی روشنی میں تشریحی اور فرعی احکام مرتب کرے (انہیں آجکل کی اصطلاح میں بائیلاز کہا جائیگا) نبی اکرمؐ نے جو تشریحی احکام مرتب فرمائے ان کی دو شکلیں تھیں۔ بعض تو ایسے جن پر زمانے کے اقتضاآت اور تغیرات اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ مثلاً قرآن کریم میں اقامتِ صلوٰۃ کا اجمالی اور اصولی حکم ہے اس کی عملی شکل نبی اکرمؐ نے متعین فرمائی جو زمانے کے تغیرات سے اثر پذیر نہیں ہو سکتی۔ ان احکامات میں قیامت تک کے لئے کسی قسم کا

ردوبدل یا حک واضافہ نہیں ہوسکتا۔ ان کی پیروی امت پر واجب ہے۔ یہ محسوس اعمال عمل متواترہ کی شکل میں نسلاً بعد نسل امت میں متوارث چلے آتے ہیں۔

(۷) دوسری قسم کے احکام وہ ہوں گے جن پر زمانے کے اقتضاآت وتغیرات اثر انداز ہوتے رہیں گے۔ ایسے معاملات میں مرکز امت قرآن کریم کے اصول، امامت کبریٰ کے اسوہ اور اپنے پیشرو مراکز کے اجتہادات کی روشنی میں استنباط کرے گا۔ اور یہ فیصلے خدا اور رسول کی اطاعت کی جگہ لیں گے۔

(۸) دین کی یہی صحیح شکل تھی جسے مسلسل آگے بڑھتے چلے آنا چاہئے تھا لیکن ملت کی بدبختی کہ یہ سلسلہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہا۔ خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہوگئی ملوکیت کے استبداد کی اطاعت کے بالکل برعکس طرح خدا اور رسول کی اطاعت ہوسکتی تھی۔ آہستہ آہستہ تاج اور کلیسا کی ثنویت کی تفریق مسلمانوں میں بھی آگئی "دنیاوی" امور میں خلیفہ (بادشاہ) کی اطاعت اور "دینی امور" میں انفرادی طور پر "علماء" کی اطاعت۔ یہ نظام یکسر غیر اسلامی تھا۔ برہمنیت کی بنیاد بھی اسی تفریق سے پڑی اور اس طرح تاج اور کلیسا ایک دوسرے کے مؤید ومعاون بنتے رہے (الا ماشاءاللہ) یہ سلسلہ امت میں آج تک جاری ہے۔

(۹) اس اختصار کے زمانے میں صدر اول میں حکومت الٰہیہ امامت ملت اور اس کے درخشندہ نتائج کے تصورات سعید روحوں کے لئے وجہ سکون اور باعث شادابیٔ قلب ونگاہ تھے اس عہد مبارک میں دین اپنی عملی شکل میں کس طرح متمکن ہوا اس کی روئیداد مختلف طور پر قلمبند کی گئی۔ روایات کے یہ مجموعے تمکن دین کی تاریخ ہیں۔[۱]

---

[۱] ابھی اگلے دنوں رسالہ ترجمان القرآن میں جناب مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کا تدوین حدیث پر ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا جس میں انہوں نے اس حقیقت کو وضاحت سے بیان کیا ہے کہ احادیث کے مجموعے اس دور کی تاریخ ہیں۔ علاوہ دیگر دلائل کے وہ تحریر فرماتے ہیں ــــ "امام بخاریؒ کی کتاب آج تو صرف بخاری شریف کے نام سے مشہور ہے لیکن یہ اس کتاب کا اصلی نام نہیں بلکہ خود حضرت امام نے اپنی کتاب کا نام الجامع الصحیح المسند المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وایامہ رکھا ہے جس میں امور اور ایام کے الفاظ قابل غور ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی صحیح تعریف امام بخاری کے نزدیک ان تمام امور کو حاوی ہے جن کا کسی نہ کسی حیثیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق ہو گا ایام کے لفظ نے تو اس کی تعریف کو اور بھی وسیع کر دیا یعنی وہی بات جو میں نے عرض کی کہ فن حدیث در اصل اس عہد اور زمانہ کی تاریخ ہے جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی ہمہ گیر عالم پر اثر انداز ہونے والی ہستی انسانیت کو قدرت کی جانب سے عطا ہوئی"۔

(طلوع اسلام)

(۱۰) یہ مجموعے چونکہ بہت دیر کے بعد مرتب ہوئے - اور اس دوران میں بہت سے ایسے اسباب پیدا ہو گئے جنکی بنا پر (دانستہ اور نادانستہ) روایات وضع ہونی شروع ہو گئیں - اس لئے ان مجموعوں میں صحیح اور موضوع ہر قسم کی روایات جمع ہو گئیں - لہٰذا یہ مجموعے کسی صورت میں بھی ظن و شبہ سے بالا نہیں قرار دیئے جا سکتے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو (متشدد طبقہ کے سوا) سب کے نزدیک مسلم ہے[1] -

(۱۱) چونکہ نبی اکرمؐ کا کوئی عمل یا فیصلہ قرآن کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا تھا - اس لئے ان مجموعوں میں صحیح اور غلط کے پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ جو چیز قرآن کریم کے خلاف ہو وہ غلط ہے - اس اصول کی روشنی میں اگر صحیح روایات کو الگ کر لیا جائے تو وہ تمکن دین یعنی حکومت الٰہیہ کے قیام کے دور کی قابل اعتماد تاریخ ہو گی جس سے حکومت الٰہیہ کے دوبارہ قیام میں بے حد فائدہ حاصل کیا جا سکے گا -

(۱۲) مندرجہ صدر تشریحات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ دین کیا ہے اور دین میں قرآن و روایات کی صحیح صحیح پوزیشن کیا ہے - یہیں سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ دین میں حجت کیا چیز ہو سکتی ہے - کھلے کھلے الفاظ میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ حجت کہتے کسے ہیں - مثلاً کسی معاملہ میں دو مسلمان آپس میں اختلاف رکھتے ہیں اس پر بحث ہو رہی ہے دلائل پیش کئے جاتے ہیں کہ اتنے میں ایک شخص قرآن کریم کی ایک آیت پیش کر دیتا ہے جو اس مسئلہ کا فیصلہ کرتی ہے - اس آیت کے سامنے آ جانے کے بعد اب کوئی بحث نہیں کی جا سکتی کوئی دلیل پیش نہیں کی جا سکتی - اس لئے کہ قرآن کی آیت دین میں حجت ہے - قرآن یقینی ہے اور الحمد سے والناس تک منزل من اللہ اور محفوظ اور اپنی صداقت اور صحت کے لئے کسی اور شے کا محتاج نہیں اس کے مقابلے میں روایات کے کسی مجموعے کو لیجئے جیسا کہ ابھی ابھی اوپر لکھا جا چکا ہے ہر روایت اپنی صحت کے لئے قرآن کی تصدیق و تائید کی محتاج ہے - اور جو چیز اپنی صحت کے لئے کسی اور کی تصدیق کی محتاج ہو وہ حجت قرار نہیں دی جا سکتی - مثلاً متذکرہ صدر اختلافی مسئلہ میں وہ تیسرا مسلمان اگر قرآن کریم کی آیت کے بجائے بخاری شریف کی کوئی روایت پیش کرے تو فریقین میں سے ہر شخص کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ اس کے صحیح ہونے کی دلیل طلب کرے - اب اگر وہ قرآن کی کسی آیت کے مطابق ہے تو اصل حجت قرآن کی وہ آیت ہو گی یہ روایت تبعاً پیش کی جا سکے گی اس لئے قرآن کے سوا کوئی چیز دین میں حجت نہیں قرار دی جا سکتی جو چیز قبول کی جا سکتی ہے -

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے باب المراسلات اشاعت ہذا - طلوع اسلام

یہ ہے مختصراً قرآن اور حدیث کے متعلق میرا مسلک۔ میں نے جیسا کہ شروع میں عرض کیا ہے خدا اور رسول کی اطاعت کی صحیح اسلامی شکل تو حکومت الٰہیہ کے قیام ہی میں ہو سکتی ہے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اسے تو اضطراری دور کہنا چاہئے۔ جس میں ہماری ہر ممکن کوشش یہ ہونی چاہئے کہ پھر سے نظم دین کی صحیح صورت جلد از جلد قائم ہو جائے۔ اس وقت یہ انفرادی جھگڑے جو آج اس طرح ہماری تمام قوتوں کو سلب اور اعمال کو بے نتیجہ بنائے جا رہے ہیں خود بخود مٹ جائیں گے قرآن اور روایات کی صحیح پوزیشن متعین ہو جائیگی۔ اطاعت الٰہیہ کا صحیح مفہوم سامنے آ جائیگا۔ کسی مولوی، مفتی، مجتہد کو انفرادی حق حاصل نہیں رہیگا کہ وہ دین کے متعلق کوئی فیصلہ صادر کرے۔ لیکن اس عبوری دور میں صحیح راہ صواب یہی ہو کہ قرآن کریم کو اپنے تمام افکار و اعمال کا مرکز بنایا جائے۔ قابل قبول صرف اس چیز کو قرار دیا جائے جو قرآن کے مخالف نہ ہو اعمال متواترہ جو نبی اکرمؐ نے متعین فرمائے اور جو امت کے پاس متوارث چلے آتے ہیں ان کی پابندی پر زور دیا جائے لیکن ان میں جو جزوی اختلافات پیدا ہو چکے ہیں انہیں اہمیت نہ دی جائے اور یوں آہستہ آہستہ ملت میں یک نگہی اور وحدت پیدا کر کے جانب منزل رواں دواں چلتے جائیں جیسا کہ میں نے شروع میں لکھا ہے اس مقصد عظیم کیلئے دعوت الی القرآن کی دعوت کا عام کرنا نہایت ضروری ہے اور یہی وہ مقصد ہے جسکے پیش نظر میں نے اس موجودہ وضاحت کی ضرورت کو محسوس کیا ہے قریب تین ہفتے سے صاحب فراش[ص۱] ہوں ابھی تک مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں ان سطور کو خود لکھ سکوں چنانچہ میں لکھ نہیں رہا املا کرا رہا ہوں۔ یوں بھی انسان کی موت اور زندگی کا کیا بھروسہ ہے لہٰذا میں نے ضروری سمجھا کہ اس مسلک کی وضاحت کر دوں تاکہ اگر میرے کسی بیان کے اجمال یا ابہام کی بنا پر کوئی صاحب دیانتداری سے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوں تو اس کا ازالہ ہو سکے اور یوں میرے مقصد کے راستے میں غلط فہمیوں کے کانٹے نہ رہنے پائیں اور مسلمان دعوت الی القرآن سے بیک نہ جائیں۔ باقی رہے وہ کج فطرت لوگ جنکا مقصد ہی لوگوں کو قرآن سے دور رکھنا اور فتنے پھیلانا ہی ان کا علاج کسی کے بس میں بھی نہیں آپ حیران ہوں گے کہ میرے علم میں ایسے لوگ ہیں جو اس سے پیشتر (پناہ بخدا) صحیح بخاری کو "خرافات کا مجموعہ" کہا کرتے تھے اور اس میں سے چن چن کر روایات نکال کر (نقل کفر کفر نباشد) ان پر بازاری استہزا کیا کرتے تھے وہ آج سب سے بڑے محافظ حدیث کا نقاب اوڑھ کر عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے میں سرگرم عمل ہیں آپکے لئے یہ چیز حیران کن ضرور ہوگی لیکن ابو جہلی نظر میں دنیا میں کیا کیا بہروپ بدلتی ہیں اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے مجھے ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں میں درخواست کرونگا ان حضرات کی خدمت میں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اعتدال سنجیدگی متانت اور خلوص کی نعمت سے نوازا ہے کہ وہ میری معروضات پر غور فرمائیں خدا کرے ان کا غور و تدبر مسلمانوں کو انکے بھولے ہوئے سبق کے یاد دلانے میں ممد و معاون ہو۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

ص۱ - الحمد للہ کہ یہ عزیز صاحب اب رو بصحت ہیں۔ (طلوع اسلام)

باب المراسلات

محترمی - السلام علیکم

مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے میرے سابقہ عریضہ کو اس قابل سمجھا کہ اُسے طلوعِ اسلام (بابت فروری ۱۹۵۳ء) میں شرفِ اشاعت بخشا۔ اس سے مجھے جرأت ہوئی کہ میں اس موضوع پر کچھ اور بھی پیش خدمت کروں۔ میں نے اس عریضہ میں گذارش کی تھی کہ جو حضرات طلوعِ اسلام کی روش کو انکارِ حدیث سے تعبیر کر کے حدیث کی مدافعت و حمایت کے مدعی ہیں فی الحقیقت وہ طلوعِ اسلام کی روش کی ایک ایک شق کو مانتے ہیں لیکن اپنے ہاں اس کا صاف صاف اقرار نہیں کرتے۔ اس عریضہ میں میں نے مدیر ترجمان القرآن سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے خیالات نقل کئے تھے۔ اس کے بعد مجھے رسالہ البرہان کے مدیر جناب سعید احمد صاحب فاضل دیوبند کی کتاب "فہم قرآن" کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ کتاب (بزعمِ خویش) "منکرینِ حدیث" کی مخالفت میں لکھی گئی ہے۔ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ جناب سعید احمد صاحب روایات کے بارے میں بعینہٖ وہی عقیدہ رکھتے ہیں جو طلوعِ اسلام میں پیش کیا گیا ہے لیکن بایں ہمہ یہ حضرات روایات کے سب سے بڑے حامی اور طلوعِ اسلام گردن زدنی۔

جناب سعید احمد صاحب شروع میں لکھتے ہیں :-

"ہندوستان میں اب ایسے حضرات کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے جو مطالب قرآنی کے صحیح فہم کے لئے احادیث کے علم کو شرط قرار نہیں دیتے۔ اُن کی رائے میں احادیث ناقابلِ اعتبار و سستاد ہیں اور اس بنا پر ان میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ تشریعِ احکام یا تفسیرِ قرآن میں اُن سے مدد لی جائے۔ اس وجہ سے ضرورت ہے کہ اس خاص مسئلہ پر کسی قدر وضاحت کے ساتھ کلام کیا جائے۔

سنت سے احتجاج کا انکار ہمارے دورِ ناسعود کی ہی خصوصیت نہیں بلکہ اس سے قبل بھی کچھ لوگ تھے جو سنت کو قابلِ احتجاج تسلیم نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے نویں صدی ہجری کے آخر میں مفتاح الجنۃ فی الاحتجاج بالسنۃ نامی کتاب اسی طرح کے ایک منکرِ حدیث کے رد میں تصنیف

فرمائی تھی، جو مصر سے شائع ہو چکی ہے۔ (فہم قرآن ص۵۹)"

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:۔

"اس سے صاف معلوم ہوا کہ ہمارے لیے قابلِ احتجاج دو چیزیں ہیں۔ ایک اللہ کا فرمان۔ اور دوسرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد۔ اگر صرف اللہ کا فرمان یعنی وحیِ متلو ہی لائقِ استناد ہوتا تو "الرسول" فرمانے کی کیا وجہ ہے؟ (ص۲۶)"

اور ملاحظہ فرمائیے:۔

"پس جو سنت قرآن پر کسی طرح بھی زائد ہوگی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک مستقل تشریع ہے اور اس کی اطاعت واجب اور معصیت حرام ہے۔ (ص۶۶)"

اس آخری اقتباس کو اچھی طرح نگاہ میں رکھئے۔ کیونکہ ذرا آگے چل کر اس دعوے کے متعلق بڑے دلچسپ حقائق کا انکشاف ہوگا۔ اس حمایت کے بعد اب یہ دیکھئے کہ تدوینِ حدیث کے متعلق آپ کے کیا ارشادات ہیں:۔

تدوینِ حدیث عہدِ نبوت میں نہیں ہوئی

"یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں حدیث لکھنے کا اہتمام نہیں کیا گیا جتنا کہ قرآن مجید کے لکھنے کا کیا گیا۔ بلکہ بعض احادیث سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کتابتِ حدیث کی ممانعت کر رکھی تھی۔

حضرت ابو سعید الخدریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ وحدثوا عنی فلا حرج ومن کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار۔ صحیح مسلم

تم میری حدیث نہ لکھو۔ اور جو شخص قرآن کے علاوہ میری حدیثیں لکھتا ہو اس کو چاہیے کہ انہیں مٹا دے۔ ہاں میری حدیث بیان کیا کرو تو اس میں کچھ حرج نہیں ہے اور جو شخص قصداً مجھ پر جھوٹ باندھے اس کو اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنا لینا چاہیے۔ (فہم قرآن ص۵۸)

بہر حال یہ ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں آپ کے اقوال و افعال کو قلمبند کرنے کا اہتمام نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی وفات کے بعد صحابۂ کرام کے پاس بجز قرآن کے کوئی دوسر

صحیفہ نہیں تھا۔ کسی ضرورت کے وقت، اگر وہ کوئی حدیث بیان بھی کرتے تھے تو اپنے حافظہ سے بیان کرتے تھے۔

بعض خاص صحیفے بخاری کی ایک روایت سے صرف حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ وہ حدیث کی کتابت کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ جو کثرتِ روایت میں مشہور تھے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بجز عبداللہ بن عمرؓ کے مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ وہ احادیث قلمبند کرتے تھے اور میں زبانی یاد رکھتا تھا۔ بعض حفاظ نے کہا ہے کہ حضرت زید بن ثابت نے علم الفرائض میں کوئی کتاب لکھی تھی لیکن اصل یہ ہے کہ عہدِ صحابہؓ میں جن صحیفوں کا ذکر ملتا ہے وہ زیادہ تر زکوٰۃ وغیرہ کے خاص احکام سے متعلق تھے ورنہ پہلی صدی ہجری کے ختم تک نہ باقاعدہ تدوینِ حدیث کی طرف توجہ کی گئی اور نہ کہیں اس کا اہتمام کیا گیا۔ ابوجحیفہ سے روایت ہے کہ انھوں نے اک مرتبہ حضرت علی سے دریافت کیا:۔

ھل عندکم کتاب	کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے؟
فرمایا۔ لا الا کتاب اللہ او فہم اعطیہ رجل مسلم او ما فی ھٰذہ الصحیفۃ۔	فرمایا نہیں صرف کتاب اللہ ہے یا وہ سمجھ جو کسی مسلمان کو عطا کی گئی ہو۔ یا وہ جو اس صحیفہ میں ہے۔

ابوجحیفہ نے پوچھا اس میں کیا ہے؟ بولے العقل وفکاک الاسیر ولا یقتل مسلم بکافر یعنی دیت کے اور قیدی کو رہا کرانے کے احکام اور ایک یہ حکم کہ کوئی مسلمان کسی کافر کے قصاص میں قتل نہ کیا جائے۔ غرضکہ پہلی صدی ہجری تک یہی حال رہا۔ (فہم قرآن صفحہ ۸۹ تا ۹۱)

ادارہ معارف اسلامیہ لاہور کے دوسرے اجلاس منعقدہ لاہور میں ڈاکٹر زبیر صدیقی کلکتہ یونیورسٹی نے "تدوینِ حدیث عہد نبوت میں" کے عنوان سے انگریزی زبان میں ایک نہایت محققانہ اور قابلِ قدر مضمون پڑھا تھا جو ادارہ کی رپورٹ میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں موصوف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ درحقیقت تدوینِ احادیث کا کام سرکار رسالت مآب کے عہد میں ہی شروع ہو گیا تھا لیکن

افسوس ہے کہ ہم پورے مضمون کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتے۔ وہ صحیفے جن کو مجموعہ ہائے احادیث کہتے ہیں وہ دراصل صحف تھے جن میں بعض خاص خاص احکام درج تھے۔ (حاشیہ فہم قرآن صفحہ ۹۱-۹۲)

دوسری صدی ہجری یعنی عہد تابعین میں بھی نہیں ہوئی

جب عمر بن عبد العزیز سریر آرائے خلافت ہوئے تو آپ نے دیکھا کہ جن بزرگوں کے سینوں میں اقوال و افعال نبوی کا ذخیرہ موجود ہے ایک کے بعد دیگرے اٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آنے والی نسلیں اس سرچشمہ سعادت سے بالکل محروم رہ جائیں تو آپ نے ابو بکر بن محمد عمرو بن حزم کو لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث اور سنت آپ کو ملے اس کو لکھ لیجئے۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں علم نہ مٹ جائے اور علماء فنا نہ ہو جائیں۔ اور تم صرف وہی لکھو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہو۔ اور علم کو پھیلانا چاہیئے۔ اور آپس میں مجالست کرو تاکہ جو شخص نہیں جانتا وہ بھی جان جائے۔

ابو بکر بن محمد انصار مدینہ میں سے تھے۔ سلیمان بن عبد الملک اور عمر بن عبد العزیز کی طرف سے مدینہ کے گورنر تھے۔ سنہ ۱۲۰ھ میں وفات پائی۔ حضرت عمر بن عبد العزیز سنہ ۹۹ھ سے رجب سنہ ۱۰۱ھ تک خلیفہ رہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تدوین حدیث کی تحریک سنہ ۱۰۰ھ کے لگ بھگ شروع ہو گئی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کی وفات کے باعث اس وقت بھی تدوین کا کام انجام نہیں پا سکا۔ یہی وجہ ہے کہ ابو بکر بن محمد کے مجموعہ احادیث کے وجود کا پتہ اب تک کہیں نہیں مل سکا ہے اور نہ جامعین حدیث میں سے کسی نے اس کا ذکر کیا ہے۔

اس بنا پر بعض مستشرقین نے اس روایت کو تسلیم کرنے سے بالکل انکار ہی کر دیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ روایت سے صرف حضرت عمر بن عبد العزیز کا جمع احادیث کی طرف متوجہ ہونا اور ابو بکر بن محمد کو اس کے لیے حکم کرنا ثابت ہوتا ہے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس حکم کی تعمیل میں احادیث جمع بھی کر دی گئی تھیں۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ اگر مسموم ہونے کے باعث حضرت عمر بن عبد العزیز کی اچانک وفات نہ ہو جاتی تو آج ہمارے پاس سب سے قدیم مجموعہ احادیث موجود ہوتا۔ (فہم قرآن صفحہ ۹۱-۹۲)

عہد بنی عباس میں تدوین حدیث کا آغاز

بنو عباس کے عہد حکومت میں جب علم و فن کا چرچا عام ہوا اور علوم و فنون کی تدوین شروع ہوئی تو علمائے اسلام نے سب سے پہلے مختلف شہروں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور آپ کی سیرت مقدسہ مدون کرنے کی طرف توجہ مبذول کی۔ (فہم قرآن صفحہ ۹۳)

دوسری وجہ یہ ہے کہ اجلۂ صحابہ چاہتے تھے کہ قرآن و حدیث میں مرتبہ کے اعتبار سے فرق باقی رہے۔ کتب میں مدون ہو جانے کے باعث ایسا نہ ہو (جیسا کہ ہوا ۱۲) کہ لوگ قرآن کو بھول جائیں اور اپنی تمام توجہ حدیث پر مبذول کر دیں۔ روایات و آثار سے ان دونوں باتوں کی تاکید ثابت ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ خطبہ میں ارشاد فرمایا ہر وہ شخص جس نے کچھ احادیث لکھ رکھی ہوں میں اس کو قسم دیتا ہوں کہ ان سے رجوع کرلے اور انھیں مٹا دے۔ پھر فرمایا:-

فانما هلك الناس حيث يتبعوا احاديث علماءهم وتركوا كتاب ربهم	لوگوں نے جب کبھی اپنے علماء کی باتوں کا اتباع کیا اور اپنے رب کی کتاب چھوڑ دی ہلاک ہوگئے۔

(اس روایت میں "احادیث علماءهم" کے الفاظ خاص طور پر قابلِ غور ہیں) (فہم قرآن صفحہ ۹۹-۱۰۰)

اس مقام پر ایک اور روایت کا نقل کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جس سے عدم کتابت حدیث کے وجوہ و اسباب پر کامل روشنی پڑتی ہے۔ عبدالرحمٰن بن الاسود اپنے والد سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں ایک مرتبہ مجھے اور حضرت علقمہ کو کہیں سے ایک صحیفہ مل گیا۔ ہم دونوں اسے لیکر غروب آفتاب کے وقت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس گئے اور دروازہ پر بیٹھ گئے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے جاریہ سے فرمایا دیکھنا دروازہ پر کون ہے؟ جاریہ بولی علقمہ اور اسود۔ حضرت ابن مسعودؓ نے ہمکو اجازت دیدی۔ گھر میں داخل ہوکر ہم نے وہ صحیفہ دکھایا اور کہا کہ یہ حدیث حسن ہے۔ حضرت عبداللہ نے جاریہ کو طشت میں پانی بھر کر لانے کا حکم دیا۔ جاریہ نے حکم کی تعمیل کی۔ آپ نے فوراً پانی سے بدستِ خود اس صحیفہ کو مٹانا شروع کر دیا۔ اور نحن نقص علیك احسن القصص پڑھنے لگے۔ ہم نے کہا ذرا اس کو تو دیکھ لیجئے۔ اس میں ایک عجیب حدیث ہے۔ لیکن حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پھر بھی نہ مانے اور اس صحیفہ کو مٹاتے ہی رہے۔ اور فرمایا:-

ان هذه قلوب اوعية فاشغلوها بالقرآن ولا تشغلوها بغيره	یہ دل برتن ہیں۔ ان کو تم قرآن مجید سے پُر کرو۔ اور اس کو دوسری چیز سے مت بھرو۔

ابو عبید جو اس قصہ کے راوی ہیں اور سند میں مذکور بھی ہیں کہتے ہیں "معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحیفہ اہلِ کتاب سے

؏ ابو عبید بیچ کے راوی ہیں اور بغیر کسی ثبوت کے صرف اپنا ایک خیال ظاہر کرتے ہیں۔ اس لئے یہ اعتذار کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ۱۲ ادارہ

لیا گیا تھا۔ اس لئے حضرت ابن مسعودؓ نے اس کو دیکھنا بھی مکروہ سمجھا۔ (فہم قرآن صفحہ ۱۰۱)

حضرت عمرؓ خود بھی روایت کم کرتے تھے اور دوسروں کو بھی قلتِ روایت کی تاکید کرتے تھے مسلمانوں کا ایک لشکر عراق کی طرف روانہ ہوا تو حضرت عمرؓ نے انھیں خطاب کرکے ارشاد فرمایا:۔

جوّدوا القرآن واقلّوا الروایۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ — قرآن خوب اچھی طرح پڑھو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کم کرو۔

بلکہ بعض اوقات تو غلط احادیث کی اشاعت کے خوف سے روایتِ حدیث کی ممانعت ہی کر دیتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کرکے فرمایا "تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیثیں بیان کرتے ہو جن میں تم خود مختلف ہوتے ہو۔ تمھارے بعد جو لوگ آئینگے وہ اس سے بھی زیادہ اختلاف کرینگے۔ پس رسول اللہ کی حدیث بیان مت کیا کرو اور تم سے کوئی بات دریافت کی جائے تو کہو۔ ہمارے اور تمھارے درمیان اللہ کی کتاب ہے۔ اس کے ہی حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام سمجھو۔ (فہم قرآن صفحہ ۱۰۱)

وضع حدیث کی گرم بازاری | جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اور تابعین عظام کے عہد میں احادیث کی باقاعدہ تدوین نہیں ہوئی۔ جو کچھ حدیثیں تھیں زبانوں پر تھیں اور اسی طرح ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتی رہتی تھیں۔ اس تقریب سے منافقوں اور دشمنانِ اسلام کو احادیث وضع کرنے کا موقع ہاتھ آگیا۔ ان لوگوں نے مسلمانوں میں اختلاط و ارتباط پیدا کرکے احادیث موضوعہ کی نشر و اشاعت شروع کی۔ اور اس طرح اسلام کو نقصان پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ابن عدی کہتے ہیں عبدالکریم ابن ابی العوجاء کو قتل کرنے کے لئے بھیجا گیا تو اس نے کہا میں نے چار ہزار احادیث جن میں حرمت و حلت کے احکام ہیں وضع کرکے لوگوں میں پھیلا دی ہیں۔

وضاعینِ حدیث کے مختلف طبقے | علامہ سیوطی نے ابن جوزی سے نقل کیا ہے کہ جن لوگوں کی احادیث میں جھوٹ، وضع اور قلب پایا جاتا ہے ان کی چند قسمیں ہیں۔ بعض وہ لوگ ہیں جن پر زہد غالب تھا۔ وہ احادیث کی حفاظت نہیں کر سکے یا ان کی کتابیں ضائع ہو گئیں۔ یحییٰ بن معین سے روایت ہے کہ میں نے

جھوٹ اس جماعت سے زیادہ کسی میں نہیں پایا جو اپنے تئیں خیر اور زہد کی طرف منسوب کرتی ہے۔ بعض وہ لوگ تھے جو اگرچہ ثقہ تھے لیکن ان کی عقلوں میں فتور آگیا تھا اور وہ پھر بھی روایتِ حدیث سے باز نہیں آتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جنھوں نے کوئی غلط روایت نقل کر دی بعد میں انھیں اپنی غلطی کا علم بھی ہو گیا۔ لیکن ازراہِ بخن پروری انھوں نے رجوع نہیں کیا۔ ان مختلف لوگوں کے علاوہ ایک زندیقوں کا طبقہ تھا جو قصداً شریعت کو برباد کرنے اور اسلام میں فتنہ و شر کا دروازہ کھولنے کی غرض سے احادیث وضع کرتا تھا۔ ان زنادقہ میں کچھ لوگ ایسے جری بھی تھے جو موقع پاکر اپنے شیخ کی کتاب اُچک لیتے اور انھیں من گھڑت حدیثیں بھی شامل کر دیتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے تھے جو کسی خاص عقیدہ و خیال کے پابند تھے اور اس کو لوگوں میں مقبول بنانے کے لیے احادیث وضع کرتے تھے۔ ابن لہیعہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے ایک خارجی العقیدہ شیخ نے کہا جس نے آخر میں توبہ کر لی تھی کہ ہم جب کسی امر کا ارادہ کرتے تھے تو فوراً اس کے لیے ایک حدیث وضع کر لیتے تھے۔

حماد بن سلمہ فرماتے ہیں میں نے ایک رافضی سے سنا وہ کہتا تھا کہ جب ہم کسی چیز کو اچھا سمجھتے تھے۔ تو اس کے لیے ایک حدیث وضع کر لیتے تھے۔ محمد بن القاسم الکاکانی فرقہ مرجیہ کا سردار تھا۔ اپنے عقیدہ کے مطابق کثرت سے احادیث وضع کرتا تھا۔ ان کے سوا کچھ وہ لوگ تھے جو ترغیب و ترہیب کے لیے وضع حدیث کو جائز سمجھتے تھے اور وہ ایسا کرتے بھی تھے۔

اسبابِ وضعِ حدیث | وضع حدیث کے اسباب مختلف تھے۔ اجمالاً انھیں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) **سیاسی جھگڑے**۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے اختلاف کی وجہ سے خوارج اور شیعہ کے جو دو فرقے پیدا ہو گئے تھے ان کو اپنے اپنے عقیدہ میں اتنا غلو تھا کہ حضرت علی اور حضرت معاویہؓ کی شان میں بے تکلف احادیث وضع کرتے اور من کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار کی وعید کی ذرا پرواہ نہیں کرتے تھے۔ پھر بنو امیہ اور بنو عباس میں جو مستقل سیاسی رقابت قائم ہو گئی تھی اس نے اس چنگاری کو ہوا دے کر دہکتی ہوئی آگ بنا دیا۔ اسی قبیل میں وہ احادیث شامل ہیں جو عربی عصبیت اور عجمی خود داری کی کشمکش کے باعث اختراع کی گئیں۔

(۲) دوسری صدی کے وسط میں کلامی اور فقہی مسائل کا زور ہوا تو اپنی وجاہت علمی کو نمایاں کرنے کیلئے

بعض لوگوں نے قصداً احادیث وضع کیں۔ اور چونکہ مسلمان ہر مسئلہ کا ثبوت قرآن و حدیث سے چاہتے تھے اس لئے بعض وضاعین نے اپنے نظریہ کی تائید کے لئے جان بوجھکر حدیثیں وضع کیں اور ان کا عام چرچا کیا۔

(۴) شخصی حکومت کے استبداد کی وجہ سے بعض لوگ ایسی محکومانہ ذہنیت رکھتے تھے کہ بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے سرکار دو عالم پر تہمت طرازی سے بھی باز نہیں آتے تھے۔" (فہم قرآن صفحہ ۹۶-۹۸)

یہ تو ہوئی تدوین حدیث کی تاریخ۔ ان سے پوچھئے کہ جو کچھ طلوع اسلام میں شائع ہوا ہے اس میں اور ان کی اس تحقیق میں کیا فرق ہے۔ اس کے بعد آپ یہ فرماتے ہیں کہ احادیث پر کن اصول سے تنقید کی جا سکتی ہے۔ ارشاد ہے :-

احادیث پر کن اصول سے تنقید کی جا سکتی ہے

ملا علی قاری نے موضوعات کے خاتمے پر حدیثوں کے نامعتبر ہونے کے چند اصول تفصیل سے لکھے ہیں اور ان کی مثالیں نقل کی ہیں۔ ہم اس کا خلاصہ اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

(۱) جس حدیث میں ایسی فضول باتیں ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نہیں نکل سکتیں مثلاً یہ کہ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے خدا اس کلمہ سے ایک پرندہ پیدا کرتا ہے جس کے ستر زبانیں ہوتی ہیں اور ہر زبان میں ستر ہزار لغت ہوتے ہیں۔

(۲) وہ حدیث جو مشاہدہ کے خلاف ہو۔ مثلاً یہ کہ بینگن کھانا ہر مرض کی دوا ہے۔

(۳) جو حدیث صریح حدیثوں کے مخالف ہو۔

(۴) جو حدیث واقع کے خلاف ہو۔ مثلاً یہ کہ دھوپ میں رکھے ہوئے پانی سے غسل نہیں کرنا چاہئے۔ کہ اس سے برص پیدا ہوتا ہے (اگرچہ تجربہ کی رو سے یہ مضمون درست ہے)

(۵) جو حدیث انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے کلام سے مشابہت نہ رکھتی ہو مثلاً یہ حدیث کہ تین چیزیں نظر کو ترقی دیتی ہیں۔ سبزہ زار، آب رواں اور خوبصورت چہرہ دیکھنا۔

(۶) وہ حدیثیں جن میں آئندہ واقعات کی پیشگوئی بقید تاریخ مذکور ہو مثلاً یہ کہ فلاں سنہ اور فلاں تاریخ میں یہ واقعہ پیش آئے گا۔

(۷) وہ حدیثیں جو طبیبوں کے کلام سے زیادہ مشابہ ہوں مثلاً یہ کہ ہریسہ کے کھانے سے قوت آتی ہے۔ یا یہ کہ مسلمان شیریں ہوتا ہے اور شیرینی پسند کرتا ہے۔

(۸) وہ حدیثیں جن کے غلط ہونے کے دلائل موجود ہوں۔ مثلاً عوج بن عنق کا قد تین ہزار گز تھا۔

(۹) وہ حدیث جو صریح قرآن کے خلاف ہو۔ مثلاً یہ کہ دنیا کی عمر سات ہزار برس کی ہوگی۔ اگر یہ روایت صحیح مان لی جائے تو ہر شخص بتا دیگا کہ قیامت کب آئیگی۔ حالانکہ قرآن سے ثابت ہے کہ قیامت کا وقت کسی کو معلوم نہیں ہے۔

(۱۰) بعض وہ حدیثیں جو مفسر علیہ السلام کے متعلق ہیں۔

(۱۱) جس حدیث کے الفاظ رکیک ہوں۔

(۱۲) بعض وہ حدیثیں جو قرآن مجید کی الگ الگ سورتوں کے فضائل میں وارد ہیں۔"

یہ تھے اصول۔ اب اس کے بعد یہ دیکھئے کہ روایات کے موجودہ مجموعے مثلاً صحیحین بالخصوص صحیح بخاری پر بھی تنقید جائز ہے یا نہیں۔ آپ فرماتے ہیں :-

"ہمارے مجموعہائے حدیث حتیٰ کہ صحیح بخاریؒ میں کیا ایسی روایتیں موجود ہیں جو روایۃً صحیح نہ ہوں؟"

ان اصول کی بناء پر ہر زمانہ میں روایات پر تنقید کیگئی ہے حافظ ابن حجر روایت معراج کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ثابت کی روایت میں جو "فَرَبَطْتُهُ بِالْحَلْقَةِ" کہ میں نے براق کو حلقہ سے باندھ دیا آیا ہے تو حضرت حذیفہ اس کی صحت سے انکار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے براق کو اس لیے باندھ دیا تھا کہ اس کے بھاگ جانے کا اندیشہ تھا؟ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ اللہ نے اس وقت آپ کے لیے عالم غیب شہادت کو مسخر کر دیا تھا۔

اسماعیلی — "بخاری کی روایت جس کا مضمون یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے والد آذر سے قیامت کے دن اس حال میں ملیں گے کہ آذر کے چہرہ پر تارکول ملا ہوا ہوگا۔" نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اس خبر کی صحت میں نظر ہے اور دلیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ پس جب اللہ تعالیٰ ان سے وعدہ کر چکا ہے کہ وہ قیامت کے دن ان کے باپ آذر کو رسوا نہیں کریگا

تو پھر اس کے خلاف کس طرح کر سکتا ہے۔"

حافظ ابن حجر حدیث ابی ہریرۃؓ۔

خلق اللہ آدم وطولہ ستون ذراعا۔	{	اللہ نے حضرت آدم کو پیدا کیا اور اُن کا طول ساٹھ گز تھا۔

کے متعلق کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امم گذشتہ کے جو آثار ثمود کے دیار کی طرح سے ہوئے پائے جاتے ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قدوقامت ترتیب سابق کے اقتضاء کے مطابق بہت زیادہ طویل نہیں تھے۔ حالانکہ ان کا زمانہ بھی بہت قدیم ہے۔ اور جو زمانہ قوم ثمود اور حضرت آدم کے درمیان ہے وہ اس زمانہ سے کم ہے جو قوم ثمود اور اُمتِ مسلمہ کے شروع زمانہ کے درمیان ہے۔ ابتک مجھکو اس اشکال کا حل معلوم نہیں ہوا۔ (فہم قرآن ص۱۷۲-۱۷۳)"

یہانتک تو تدوینِ حدیث کی تاریخ اور روایات کے موجودہ مجموعوں کی تنقید کی حد سے بالاتر نہ ہونے کے متعلق ذکر تھا۔ اس کے آگے پڑھئے تو وہ دلچسپ ٹکڑا آپ کے سامنے آئیگا جس کے متعلق ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ جناب سعید احمد صاحب نے پہلے ارشاد فرمایا تھا کہ ہمارے لئے قابلِ احتجاج دو چیزیں ہیں۔ ایک اللہ کا فرمان اور دوسرا رسول اللہ کا ارشاد۔ اور یہ کہ جو سنت کسی طرح بھی قرآن پر زائد ہوگی وہ آنحضرت کی طرف سے ایک مستقل تشریع ہے۔ اب دوسرا بیان ملاحظہ فرمائیے ؎

"حدیث مستقل تشریع نہیں بلکہ بیان وتفصیلِ وحیِ الٰہی ہے	|	یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہم نے حدیث کی تشریعی حیثیت کا بار بار ذکر کیا ہے اور اس کو آیات بینات سے ثابت کر چکے ہیں

لیکن یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہئے کہ تشریع کے باب میں قرآن وحدیث دونوں ایک پایہ کے نہیں ہیں۔ قرآن قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ والحکم ہے اور حدیث ظنی۔ پھر دونوں قوت وحکم کے اعتبار سے یکساں کس طرح ہوسکتے ہیں۔ اس بناء پر اگر کوئی حدیث قرآن مجید کے کسی قطعی حکم کے خلاف ہو تو اس کو قبول نہیں کیا جائیگا۔ کیونکہ سند و الفاظ حدیث کے لحاظ سے اس میں متعدد احتمالات ہوسکتے ہیں بعض لوگوں کو اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول اور ما اتٰکم الرسول فخذوہ کو دیکھکر یہ شبہ ہوگیا ہے کہ قرآن کی طرح سنت بھی تشریع میں مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ اور یہ خیال درست نہیں

کیونکہ قرآن مجید نے ہی خود اس کی بھی تصریح کی ہے کہ

وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحیٌ یوحیٰ۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہش سے کچھ نہیں فرماتے بلکہ وہ نازل شدہ وحی ہوتی ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل تو وحی (قرآن) ہے اور نطق نبوی علیٰ صاحبہ الصلوۃ والسلام اس سے نکلی ہوئی فرع - اس بناء پر لامحالہ نطق گرامی وحی متلو کے مطابق ہوگا - بالفرض اگر دونوں میں مطابقت کی کوئی صورت نہ ہو تو حدیث کو ترک کرنا پڑیگا۔ لیکن اس حیثیت سے نہیں کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے بلکہ اس وجہ سے کہ قرآن کے ایک حکم ظاہر الدلالۃ سے متعارض ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس قول کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف انتساب ہی نادرست ہے۔

پس سنت کی تشریع سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ قرآن کی طرح اس باب میں مستقل حیثیت رکھتی ہے بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ سنت' وحی الٰہی کے لئے بمنزلۂ بیان اور تفصیل ہے۔ (فہم قرآن صفحہ ۹۸)

اس اقتباس سے حسب ذیل امور واضح ہیں :-

(۱) تشریع کے باب میں قرآن و حدیث دونوں ایک پلّہ کے نہیں ہیں۔

(۲) قرآن قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ والحکم ہے اور حدیث ظنی۔

(۳) قرآن کی طرح سنت' تشریع میں مستقل حیثیت نہیں رکھتی۔

(۴) اگر قرآن و حدیث میں تعارض ہو تو حدیث کو ترک کرنا پڑے گا۔

(۵) سنت' وحیِ الٰہی کے لئے بمنزلۂ بیان اور تفصیل ہے۔ مستقل تشریع نہیں۔

ان اقتباسات کی روشنی میں' میں ہر اس شخص سے جو علم اور دیانت رکھتا ہو پوچھتا ہوں کہ اگر حدیث کے متعلق اس عقیدہ کے بعد جو جناب سعید احمد صاحب نے بیان فرمایا ہے ایک شخص پکا حدیث کا ماننے والا کہلا سکتا ہے تو طلوع اسلام والوں نے کیا جرم کیا ہے جو ان کو اس طرح سے بدنام کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ جہانتک میں سمجھا ہوں وہ تو اعمال متواترہ کو جن کی عملی شکل رسول اللہؐ نے متعین فرمائی دین کا جزء قرار دیتے ہیں اور ان کی مستقل حیثیت تسلیم کرتے ہیں اور یہ صاحب ہیں کہ جو سنت کو تشریع میں کوئی مستقل حیثیت ہی نہیں دیتے۔ بس فرق یہی ہے کہ طلوع اسلام والے ایک ہی بات

کہتے ہیں اور یہ حضرات صفحہ ۶۶ پر سنت کی مستقل تشریع کا اعلان فرماتے ہیں اور صفحہ ۸۴ پر اس کا صاف انکار کر دیتے ہیں اور اگر ان حضرات کی اس روش پر اعتراض کرو تو ایسی ایسی دلچسپ تاویلات سے کام لینگے کہ عقل حیران رہ جائیگی۔

طلوعِ اسلام میں منجملہ دیگر اُمور کے یہ لکھا گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے فرعی احکام جو تغیراتِ زمانہ سے اثر پذیر ہو سکتے ہوں بعد کے خلفاء ان میں اپنے حالات کے مطابق تغیر و تبدل کر سکتے ہیں۔ اس کے متعلق سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی ارشاد فرماتے ہیں:۔

پہلی شرط فروعی قوانین مدون کرنے کیلئے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ مزاجِ شریعت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ یہ بات صرف قرآن مجید کی تعلیم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں تدبر کرنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ ان دونوں چیزوں پر جس شخص کی نظر وسیع اور عمیق ہوگی وہ شریعت کا مزاج شناس ہو جائیگا اور ہر موقع پر اس کی بصیرت اس کو بتا دیگی کہ مختلف طریقوں میں سے کون سا طریقہ اس شریعت کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے اور کس طریقہ کو اختیار کرنے سے اس کے مزاج میں اعتدال پیدا ہو جائیگی۔ اس بصیرت کے ساتھ احکام میں جو تغیر و تبدل کیا جائیگا وہ نہ صرف مناسب اور معتدل ہوگا بلکہ اپنے محلِ خاص میں شارع کے اصل مقصد کو پورا کرنے کے لئے وہ اتنا ہی بجا ہوگا جتنا خود شارع کا حکم ہوتا۔ اس کی مثال میں بہت سے واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً حضرت عمر کا یہ حکم کہ دورانِ جنگ میں کسی مسلمان پر حد نہ جاری کی جائے۔ اور جنگ قادسیہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص کا ابو محجن ثقفی کو شرب خمر پر معاف کر دینا، اور حضرت عمر کا یہ فیصلہ کہ قحط کے زمانہ میں کسی سارق کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ یہ امور اگرچہ بظاہر شرع کے صریح احکام کے خلاف معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جو شخص شریعت کا مزاج داں ہے وہ جانتا ہے کہ ایسے خاص حالات میں حکمِ عام کے امتثال کو چھوڑ دینا مقصودِ شارع کے عین مطابق ہے۔ اسی قبیل سے وہ واقعہ ہے جو حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں کے ساتھ پیش آیا قبیلہ مزینہ کے ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی کہ حاطب کے غلاموں نے اس کا اونٹ چرا لیا ہے حضرت عمرؓ نے پہلے تو ان کے ہاتھ کاٹ جانے کا حکم دے دیا، پھر فوراً ہی آپ کو تنبہ ہوا اور آپ نے فرمایا کہ تم نے ان غریبوں سے کام لیا اور ان کو بھوکا مار دیا۔ اور اس حال کو پہنچایا کہ اگر ان میں سے کوئی شخص حرام چیز بھی کھالے تو اس کیلئے جائز ہو جائے یہ کہکر آپ نے ان غلاموں کو معاف کر دیا اور ان کے مالک سے اونٹ والے کو تاوان دلوایا۔ اسی طرح تطلیقاتِ ثلاثہ کے

مسئلہ میں حضرت عمرؓ نے جو حکم صادر فرمایا وہ عہد رسالت کے عمل درآمد سے مختلف تھا، مگر چونکہ احکام میں یہ تمام تغیرات شریعت کے مزاج کو سمجھ کر کیے گئے تھے اس لیے ان کو کوئی نامناسب نہیں کہہ سکتا۔ بخلاف اس کے جو تغیر اس فہم اور بصیرت کے بغیر کیا جاتا ہے وہ مزاج شرع میں بے اعتدالی پیدا کرتا ہے اور مفضی الی الفساد ہو جاتا ہے۔"

سید صاحب اس عقیدہ کے باوجود منکر حدیث نہیں ہیں۔

طلوع اسلام نے یہ بھی لکھا تھا کہ روایات دین کی تاریخ ہیں۔ جون، جولائی۔ اگست ۱۹۶۱ء کے ترجمان القرآن میں تدوین حدیث پر مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا تعارف جناب مودودی صاحب ان الفاظ میں کراتے ہیں:-

"حدیث کے متعلق ایک مدت سے ہندوستان میں غلط فہمیاں پھیل رہی ہیں۔ جن کی بنا چاہے نیک نیتی پر ہی ہو مگر بہرحال نادانفیت پر تو ضرور قائم ہے اور اس سے فی الواقع دین کو بڑا نقصان پہنچ رہا ہے۔ حال میں اس فتنہ میں پھر تازہ روح پھونکی گئی اور بہت سے لوگ اس سے گمراہ ہوئے۔ ترجمان القرآن میں اس سے پہلے حدیث کے متعلق متعدد مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ جن میں سے اکثر میری کتاب تفہیمات حصہ اول میں جمع کر دیے گئے ہیں لیکن کوئی مبسوط بحث کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ الحمدللہ کہ اس کمی کو جناب مولانا مناظر احسن صاحب نے بطریق احسن پورا کر دیا ہے۔"

اس مضمون میں جناب گیلانی صاحب ارشاد فرماتے ہیں:-

"حدیث دراصل انسانیت کے ایک حیرتناک انقلاب کی تاریخ ہے ــــ اور بس"

دنیا کی اسی تاریخ کے ایک عظیم الشان حیرت انگیز انقلابی حصہ کا نام سچ پوچھئے تو حدیث ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جن انقلابات و حوادث سے گذر کر نسل انسانی موجودہ حالت تک پہنچی ہے۔ ان میں ایک ایسا واقعہ جس نے کسی خاص شعبۂ حیات ہی میں نہیں بلکہ مذہبی، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی تمام شعبوں میں انسانیت کا رُخ پلٹ دیا۔ جس سے زمین کا کوئی خاص حصہ نہیں بلکہ بلا مبالغہ مشرق و مغرب دونوں متاثر ہوئے۔ ہو رہے ہیں اور ہوتے رہینگے۔ ماضی کے اسی مدہش، حیرت انگیز واقعہ کی تاریخ یا تفصیلی بیان کا نام حدیث ہے۔

حدیث کو تاریخ کہنا نئی بات نہیں ہے

ماسوا اس کے سچ یہ ہے کہ بالکلیہ یہ میری تعبیر ہے بھی نہیں۔ فن حدیث کے سب سے بڑے امام، امام الائمہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کا نام جو رکھا ہے اگر اسی پر غور کرلیا جائے تو بآسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بلکہ سمجھنے والوں نے ہمیشہ اس فن کو اسی نگاہ سے دیکھا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب آج تو صرف بخاری شریف کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن یہ اس کتاب کا اصلی نام نہیں ہے۔ بلکہ خود حضرت امامؒ نے اپنی کتاب کا نام "الجامع الصحیح المسند المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وایامہ" رکھا ہے۔ اس میں امور اور ایام کے الفاظ قابل غور ہیں۔ جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی صحیح تعریف امام بخاری کے نزدیک ان تمام امور کو حاوی ہے جن کا کسی نہ کسی حیثیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق ہو۔ آگے ایام کے لفظ نے تو اس کی تعریف کو اور بھی وسیع کردیا۔ یعنی وہی بات جو میں نے عرض کی تھی کہ فن حدیث دراصل اس عہد اور زمانہ کی تاریخ ہے جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جیسی ہمہ گیر عالم پر اثر انداز ہونے والی ہستی انسانیت کو قدرت کی جانب سے عطا ہوئی۔ بہرکیف اگر اصطلاحی جھگڑوں سے الگ ہوکر پھل سے درخت کو پہچاننے کے اصول کو مدنظر رکھا جائے تو حدیث کے موجودہ ذخیرہ پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد بھی ایک معمولی آدمی اس کا اندازہ کرسکتا ہے کہ حدیث کی صحیح حقیقت اور اس کی واقعی تعریف وہی ہوسکتی ہے جس کی طرف حضرت امام بخاری نے اپنی کتاب کے نام میں اشارہ فرمایا ہے اور میں نے جس کی تشریح کی ہے۔ (تدوین حدیث ص ۳۸۳/۳۸۴)

اس میں وضاحت سے درج ہے کہ خود امام بخاریؒ۔ مولنا گیلانی اور مولنا مودودی صاحب کے نزدیک صحیح بخاری جیسی کتاب رسول اللہ کے عہد مبارک کی تاریخ ہی ہے۔

اور سنئے دارالمصنفین کے سید سلیمان ندوی صاحب جس قدر حدیث کے مؤید ہیں وہ کوئی چھپی ہوئی حقیقت نہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب علامہ اسلم جیراجپوری نے روایات پر تنقید کے متعلق مضمون شائع کیا تھا تو معارف میں پے در پے ان کی مخالفت میں سینکڑوں صفحات شائع ہوئے تھے۔ لیکن اب ذرا آگے چلئے۔ فروری ۱۹۴۲ء کے معارف میں

علامہ حمید الدین فراہیؒ اور علم حدیث کے متعلق ان کے شاگرد مولوی امین احسن صاحب اصلاحی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس پر مدیر معارف سید سلیمان ندوی صاحب نے کوئی اختلافی نوٹ نہیں لکھا۔ غور فرمایئے کہ اس مضمون میں کیا کچھ لکھا گیا ہے۔

"دوسری بات یہ ہے کہ مولانا ان لوگوں کے خیال سے بھی اتفاق نہیں رکھتے جو بخاری و مسلم کی تمام مرویات کو ظن سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ اور یہ بات مولانا نے کوئی نئی اور عجیب نہیں لکھی ہے حافظ ابن حجر اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی بھی ان کتابوں کو ظن سے بالاتر نہیں سمجھتے۔ ظن سے بالاتر تو سماء دنیا کے نیچے صرف ایک ہی کتاب ہے۔" (معارف ص ۹۵-۹۴)

اس کے بعد ارشاد ہے:۔

"پس ہم کو صرف وہ روایتیں قبول کرنی چاہئیں جو قرآن کی تصدیق و تائید کرے ..... جب قرآن اور حدیث میں اختلاف ہو تو اس وقت حکم قرآن ہوگا۔" (معارف ص ۹۲-۹۱)

صفحہ ۹۰ پر ارشاد ہے:۔

"یہاں مولانا نے بے شبہ یہ لکھا ہے کہ احادیث میں ظن و شبہ کو دخل ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو۔"

لیجئے احادیث میں ظن و شبہ کے باب میں معاملہ علامہ فراہیؒ، مولوی امین احسن صاحب اور سید سلیمان ندوی تک ہی نہ رہا بلکہ ان حضرات کے قول کے مطابق یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو۔

معاف فرمایئے۔ یہ عریضہ پھر بہت لمبا ہو گیا۔ لیکن کیا کیا جائے ہم جیسے عامی تو جب ان علماء حضرات کی اس روش کو دیکھتے ہیں تو عقل دنگ رہ جاتی ہے ہم لوگوں کو تو یہ خطاب کے قابل ہی نہیں سمجھتے ورنہ میں ان کی خدمت میں گذارش کرتا کہ خدا کے لئے کبھی کھلے کھلے اور واضح الفاظ میں اتنا تو فرما دیجئے کہ آپ کے نزدیک روایات کے موجودہ مجموعوں کی اصلی حیثیت کیا ہے۔ لیکن یہ کبھی ایسا نہیں کرینگے۔ ایسا کرنے میں بڑے بڑے نقصانات کا احتمال ہے۔

والسلام

(ہم نے اپنے اس بھائی کی پہلی چٹھی کے آخر میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا انھیں ہم پھر دہراتے ہیں (طلوع اسلام)

سوال

(۱)

اک نظر دیکھ ستاروں کا سماں
شب کی ظلمت میں شراروں کا جہاں
ہے مقام اُن کا ابد کی آغوش
ان کی دُنیا میں نہ فردا ہے نہ دوش
ان کا آغاز نہایت تیری
اُن کی تمہید حکایت تیری
جادہ پیمائی پہ مجبور مدام
رات دن رہتے ہیں مصروفِ خرام
دردِ اُلفت سے ہیں کس کے بیتاب؟
مضطرب کیوں ہیں مثالِ سیماب؟
کس کی خاطر ہیں سدا دیدہ کشا؟
ہم نفس کچھ تجھے معلوم ہے کیا؟

(۲)

وہ کہ ہے صبحِ ازل، شامِ ابد!
حاملِ ذاتِ احد شانِ صمد
جانِ ہر شے، دلِ ہر شے میں نہاں
ہر دو عالم کی ہے وہ روحِ رواں
اس کے پرتو سے رُخِ گل میں دمک
گوہرِ قطرۂ شبنم میں چمک
ہیں منوّر سرو و پروین اس سے
شفقِ شام ہے رنگین اس سے
جب وہ ہر ذرّے میں ہے جلوہ نما
جب وہ ہر چیز کی ہے وجہِ بقا
پھر مری آنکھوں سے مستور ہے کیوں؟
قلبِ مضطر سے مرے دور ہے کیوں؟

(۳)

رازِ سربستہ ہو تقدیر مری
حرفِ گم گشتہ ہو تفسیر مری!
گرچہ ہوں چشمِ دو عالم پہ عیاں
اپنی آنکھوں سے ہوں لیکن پنہاں
راز ہے میری تگ و دو کا تاں
میرا آئینہ نہ ماضی ہے نہ حال
یہ اگر سچ ہے کہ انجام مرا
کنجِ مرقد میں ہو آغوشِ فنا!
ہے اگر درد و غم و سوزِ حیات
فقط افسانۂ امروزِ حیات
آنکھ مشتاقِ تماشا کیوں ہے؟
دل رہینِ غمِ فردا کیوں ہے؟

(الطاف)

اقبال
شخصیت اور پیام

(یہ مضمون رسالہ جوہر کے اقبال نمبر میں ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا مضمون کی افادیت کا تقاضہ ہے کہ اسے قارئین طلوع اسلام تک بھی پہونچایا جائے جی چاہتا تھا کہ قارئین سے صاحب مضمون کو تعارف بھی کرا دیا جائے لیکن جب وہ خود حجاب میں رہنا چاہتے ہیں تو ہم نقاب کشائی کیوں کریں ۔ طلوع اسلام)

"اقبال کو اپنی استعداد کے مطابق سمجھنے کی کوششوں کا حاصل یہ صفحات ہیں استعداد اور نتائج تو محل اعتراض ہو سکتے ہیں لیکن شاید کوشش کے خلوص میں کسی کو کوئی شبہ نہ ہو" (ایک جامعی)

(۱)

زندگی اپنا ظہور چاہتی ہے اور جب کوئی امر اس ظہور میں مانع ہوتا ہے تو زندگی کے پوشیدہ سوتے خشک نہیں ہو جایا کرتے ان سے پانی رس رس کر جمع ہوتا رہتا ہے اور آخرکار انقلاب کی شکل میں پھوٹ نکلتا ہے ۔ اس کا نام انقلاب ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی کشمکش انقلاب پر مجبور ہے، قوموں کا ضمیر جب زندگی کے اس شعور سے خالی ہو جاتا ہے تو وہ زندگی کی صحیح نمود میں رکاوٹیں ڈالتی ہیں، پرانی رسمیں دین و ایمان بن جاتی ہیں، جماعت کے قانونی شکنجے شریعت الٰہی کے نام سے افراد کے جذبۂ نمو کو ابھرنے سے روکتے ہیں، تجدید الحاد اور انقلاب کفر سمجھا جاتا ہے، دلوں میں ولولے پیدا ہوں تو ان کا اظہار گناہ قرار پاتا ہے، دماغ جستجو کریں تو وہ گمراہی سے تعبیر ہوتی ہے ۔ کبھی کوئی مردِ خدا اس جمود کو توڑنے کی کوشش کرے تو شریعت و قانون کے محافظ اس کو دار پر لٹکاتے ہیں یہ ہے کسی قوم کی موت ؎

ہر چیز ہے محوِ خود نمائی ہر ذرہ شہیدِ کبریائی
بے ذوقِ نمود زندگی موت تعمیرِ خودی میں ہے خدائی

فرد مرتا ہے فنا نہیں ہوتا، بھلا قوم مر کر کیسے فنا ہو سکتی ہے، خدا تعالےٰ زندہ انسانوں کا خدا ہے ۔ وہ موت میں بھی زندگی کے سامان کر دیتا ہے ۔ جب کوئی قوم زندگی کی اس منزل میں پہنچتی ہے تو فطرت زندگی کے دبے ہوئے تقاضہ کو ابھارتی ہے، موت اور زندگی میں کشمکش ہوتی ہے، زندگی حق ہے وہ غالب آتی ہے کفر

باطل ہے فنا ہو جاتا ہے۔

قل جآء الحق وزھق الباطل۔ ان الباطل کان زھوقا ہ

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی ۔ روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب

زندگی کا یہ ذوقِ انقلاب نئی دنیا تعمیر کرتا ہے۔ انسانیت نیا جنم لیتی ہے اور افراد کے دل اور دماغ کی کایا پلٹ جاتی ہے ؎

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب
ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارا لعلِ ناب
یہ محبت کی حرارت، یہ تمنا، یہ نمود
فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب

(۲)

محمد رسول اللہ کا ظہورِ اقدس عالمِ انسانیت میں ایک ایسا ہی زبردست انقلاب تھا جو پرانی دنیا کے لئے پیامِ موت لیکر آیا۔ پرانی دنیا کی جگہ نئی دنیا نے لے لی۔ انسان کا جسم قیصروں اور کسراؤں کی زنجیروں سے آزاد ہوا، اس کا ضمیر احبار اور رہبان کی خانہ ساز شریعتوں کے بندھنوں سے چھوٹا۔ نوعِ انسانی کی غلامی کی بیڑیاں کٹیں، زندگی کی نمود میں جو موانع تھے ختم ہوئے، انسان کی خودی نے خدائی جامہ پہنا اس کا فکر و عمل آزاد ہوا، ذوقِ نمود نے عالمِ کائنات میں زندگی کے معجزات دکھائے، انسان جن و ملائک کا مسجود تھا، کائنات و موجودات اس کی فرماں پذیر آخر وہ نیابتِ الٰہی کے منصب سے سرفراز ہو کر خدا کی خدائی کا مالک بنا۔ اس تخیل سے انسانیت کو فروغ ہوا اور اس کا قافلہ حیات جو صدیوں سے ایک جگہ رکا کھڑا تھا پھر شاہ راہ ترقی پر قدم بڑھانے لگا۔ اس انقلاب کی سعادتِ قیادت ملتِ اسلامی کو ملی۔

اسلام ایک عالمگیر انقلابی تحریک تھی۔ کم نظروں نے اسے صرف مادی شکل میں دیکھا اور مسلمانوں کے سیاسی انحطاط کے یہ معنی سمجھے کہ اسلام کی عمر پوری ہو گئی، لیکن اسلام کے معنوی اثرات زندہ جاوید ہیں - وہ ان معنوں میں امسٹ ہے، وہ خدا کا آخری پیغام ہے اور تمام انسانیت کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے اس لئے کہ اسلام دعوتِ انقلاب کا دوسرا نام ہے اور انقلاب زندگی کا فطری تقاضہ ہے، جب تک زندگی کا وجود ہے انقلاب موجود رہے گا۔ گو انقلاب کی شکلیں بدلتی رہیں، لیکن روحِ انقلاب کو زوال نہیں، وہ

ابدی ہے اور اس روحِ انقلاب کا ترجمان اسلام ہے ؎

ستیزہ کارہائے ازل سے تا امروز — چراغِ مصطفوی سے شرار بولہبی
حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز — سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفاطلبی
کشاکشِ نرم و گرما، تپ و تراش و خراش — زخاکِ تیرہ دروں، تا بہ شیشہ حلبی
اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام — یہی ہے رازِ تب و تابِ ملّتِ عربی

مسلمان جس پیغام کے حامل تھے اس سے روگردانی کرنے لگے، قیصر و کسریٰ کی جگہ سلاطین نے لے لی علماء اور فقہاء احبار اور رہبان بنے، اسلام کے نام سے ظلم و جور ہونے لگا، فکر و عمل کی آزادی گناہ ٹھہری، اور زندگی کی نمود کو شریعت الٰہی" کی خلاف ورزی قرار دیا گیا، نتیجہ یہ نکلا کہ فطرت کی تعزیرات نے اسلامی ملّت کے ساتھ وہی سلوک کیا جو پہلی امتوں سے کیا گیا تھا ترقی کے قدم رک گئے انقلاب کا دھارا پانی کے چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں تبدیل ہو گیا، اور اس میں بساند پھیل گئی۔

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا — منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

ملّت اسلامی نے اور قوموں کی طرح آئینِ نو کو بدعت سمجھا اور طرزِ کہن پر آنکھیں بند کر کے چلے جانا ثواب۔ آئینِ نو زندگی کا تقاضہ تھا طرزِ کہن کی پشت پر سیاسی ادارے اور مذہبی جماعتیں تھیں دونوں کی کشمکش ناگزیر تھی۔ اسلام کا خمیر انقلاب سے اٹھا تھا اور اس انقلاب کی رُوح قرآن کریم کی شکل میں زندہ تھی اس کے خلاف لاکھ قلعے تعمیر ہوا کئے لیکن ملّت کا ضمیر ان کو پرکاہ سے زیادہ اہمیت نہ دے سکتا تھا، قرآن کریم کی اس تعلیم سے مسلمانوں کو جو عقیدت اور شیفتگی تھی اس نے انقلاب کی روح کو زندہ رکھا اور اسلام زوال اور فنا کی تقدیر کا نشانہ بننے سے سلامت رہا۔

(۳)

ایک مبصر لکھتا ہے کہ جب کبھی ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب بے رُوح قیود اور جامد قواعد کا جامہ پہن لیتا ہے تو زندگی بخش روحانیت کو بحال کرنے کے لئے قوم میں ایک برقی رو دوڑ جاتی ہے، اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ہمیں ابتدا ہی سے تجدید کی رو کا وجود نظر آتا ہے جمود کے خلاف ہمیشہ ایک جذبہ کام کرتا رہا۔ جب حالات ناسازگار ہوتے تو یہ جذبہ مدہم پڑ جاتا اور سازگار ماحول میں انقلاب کی شکل میں ملّت کے سامنے رونما ہو جاتا، اقبال اسی ولولہ انقلاب اور تحریک تجدید کا زبردست ترین مظہر ہے۔ ان سطروں میں اس

تحریک کا پس منظر اور اس کی روشنی میں اقبال کی دعوتِ انقلاب کا ذکر ہے۔

اسلامی ملت کے ضمیر میں کم و بیش ایک صدی تک اسلام کی اصلی رُوح انقلاب جلوہ گر رہی۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کی زندگی میں مقناطیسی تاثیر تھی وہ جدھر کا رُخ کرتے لوگ ان کے دائرۂ اثر میں کھنچے چلے آتے۔ اپنا مذہب چھوڑ کر ان کا مذہب لے لیتے، اپنی زبان، معاشرت اور تمدن کو خیرباد کہہ کر ان مسلمانوں کی زبان معاشرت اور تمدن اختیار کرتے، اس دور کی آخری شخصیت حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کی ہے، ان کی ذات ملت کے دینی قوائے حیات کا آخری لیکن نہایت شاندار نمونہ تھی۔

اس ایک صدی میں سیاسی ابتری نے جماعتی زندگی کا شیرازہ منتشر کر دیا، اور افراد کا "نفس مطمئنہ" شک و انکار کا شکار ہونے لگا لوگوں نے اخلاقی و مذہبی قدروں کو تنقیدی نظر سے دیکھنا شروع کیا، جبر و قدر کی بحثیں ہونے لگیں، گناہوں کا ارتکاب ہوتا تھا، سوال یہ تھا کہ ان کی ذمہ داری بندوں پر ہے یا بندوں کے خالق پر۔ اس کے ساتھ ساتھ اموی، علوی، عباسی اور خارجی نزاعوں نے اخلاقی زندگی پر اثر ڈالا، دلوں سے اطمینان اٹھ گیا اور دماغ فضول بحثوں کی الجھنوں میں پھنس گئے۔

اسلام کی دوسری صدی تداخل (TRANSITIONAL) کا زمانہ ہے۔ مذہبی قدروں کی حرمت باقی نہ تھی، نئی قدریں بنے نہ پائی تھیں، زندگی ایک اضطراب و ہیجان کے عالم سے گذر رہی تھی، بنی عباس کے برسرِ اقتدار آنے سے ایرانی عنصر کو ملی زندگی میں غلبہ نصیب ہوا، اس سے پرانی قدروں کی عمارت اور بھی کمزور ہو گئی۔ عرب دشمنی الحاد و زندیقی اور اخلاقی قواعد کا استہزا معیارِ فیشن بنا، اس دور کے ترجمان بشّار اور ابونواس ہیں، جن کے اشعار فسق و فجور اور بداخلاقی اور بے دینی کا اشتہار تھے اور لوگ ان کو نہایت شوق سے پڑھتے تھے۔

منصور اور مہدی نے بزورِ شمشیر اخلاق کی پرانی قیود میں رعایا کو جکڑنا چاہا، ہزاروں بے دینی اور زندیقی کے الزام میں قتل ہوئے۔ ایرانی عنصر کے زور کو توڑنے کی کوششیں ہوئیں، لیکن مذہبی زندگی کا وجدانی شعور کمزور ہو چکا تھا، سختی سے لوگ نیک بننے سے رہے، ایک کشمکش تھی دو قسم کے خیالات میں، ایرانی اور عرب جماعتیں ان خیالات کی ترجمان تھیں۔ ان کی رقابت زندگی کے ہر شعبہ میں اثر انداز تھی۔ ہارون ابتدا میں ایرانی اثر میں تھا، آخر میں عربی عصبیت کا زور ہوا، برامکہ تباہ ہوئے، ہارون کے بعد امین اور مامون کی جنگ ایرانی اور عربی جماعتوں یا یوں کہیئے دو نقطۂ خیالات کی جنگ تھی، مامون کامیاب ہوئے اور امین کی ناکامی کے

ساتھ ملت اسلامی کی زندگی نے نیا چولا بدلا حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے زمانہ سے مذہب اور اخلاق کی پرانی قدریں بے اثر ہو رہی تھیں، مامون نے ان قدروں کو نئی شکل دینے کی کوشش کی۔

مامون ملی زندگی کی عمارت کو ایرانی اور عربی عناصر کے اتحاد اور مذہب و فلسفہ کے امتزاج کی بنیادوں پر اٹھانا چاہتا تھا، اس نے دیکھا کہ مذہب کی وجدانی روح عملی زندگی میں اپنا اثر ڈالنے سے عاجز ہے اس کی وجہ سے قوم کا اخلاقی اساس سرے سے ختم ہو رہا ہے، مامون نے کوشش کی کہ فلسفیانہ تعلیم و تربیت سے اخلاقی اساس کو استحکام ملے، یونانی فلسفہ کی حکومت نے حصول افرائی کی عقائد کا عقل و منطق سے میل ثابت کیا گیا، نیکوکاری اور اعمال صالح کی افادیت اور برتری ارسطو اور افلاطون کے اقوال سے لوگوں کے ذہن نشین کی گئی لیکن وجدانی زندگی کے بغیر مذہب میں کیسے جان آسکتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب خیالی موشگافیوں کا نام رہ گیا۔ عملی زندگی سے بے تعلق باتوں پر زور دیا جانے لگا نہ ملت کی عملی زندگی درست ہوئی اور نہ قلبی سکون باقی رہا۔

جمہور سلف پرست تھے، ان کے دل و دماغ "اسباب و علل" کی الجھنوں سے دور قرآن و حدیث کی روشنی سے اپنا اطمینان حاصل کرتے تھے عقل پرست گروہ نے تلوار سے انھیں قائل کرنا چاہا تو وہ نئی راہ سے اور بدکے۔ مذہب و فلسفہ کی یہ کشمکش ۲۳۲ھ تک حکومت کی حکمت عملی پر موثر رہی، متوکل کے تخت نشین ہوتے ہی عقل پرستوں کا ستارہ گردش میں آیا، ملت نے تقلید کو دماغی پریشانیوں سے بچنے کا ذریعہ جانا اور "معتزلیت" کے بجائے "حنبلیت" حکومت کا مذہب بنی۔

سلف صالحین کی کوری تقلید دلوں کو کب تک تسکین دیتی۔ عقل کی زبان یہ کہہ کر کب تک بند کی جاتی کہ سلف صالحین اس قسم کی گفتگو پسند نہ فرماتے تھے عقل پرستوں کی تحریک اندر ہی اندر سرگرم عمل رہی ۳۲۰ھ میں امام ابوالحسن اشعری نے اس تقلیدی تحریک کو عقل و فلسفہ سے قریب کرنے کی طرح ڈالی، امام صاحب خود عقل پرستوں کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے چالیس دن کی سخت کشمکش کے بعد ایک جمعہ کو آپ نے بصرہ کی جامع مسجد میں عقل پرستی سے توبہ اور سلف پرستی پر ایمان کا اعلان کیا، اور عقلی حربوں سے تقلیدی تحریک کو نئی زندگی بخشی۔ اشعریت دنیائے اسلام پر چھا گئی اور کوری بے عقل تقلید اور خالص عقل پرستی کا سکہ دلوں سے اٹھنے لگا۔

زمانہ آگے نکل گیا، اور اشعریت جامد کی جامد رہی۔ نئے خیالات اور بدلے ہوئے حالات نے اشعریت

کی بنیادیں ہلا دیں، سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا تھا، اشعریت بے جان قیود میں اسیر تھی، عوام بے حس اور علماء غافل تھے، تصوف شرعی اور اخلاقی پابندیوں سے نکل جانے کے لئے بیتاب تھا جو شخص اخلاقی قیود یا آئینی پابندیوں سے گھبراتا وہ تصوّف میں پناہ لیتا، فلسفی افکار بے معنی استدلات اور بیکار کی درد سری سے آگے نہ بڑھنے پائے تھے، زندگی کا کوئی اساس نہ تھا جو قلب کو اطمینان اور دماغ کو سکون بخشتا باطنی تحریک نے عالم اسلام میں انتشار پیدا کر دیا تھا، حسن بن صباح کے فدائیوں کی وجہ سے کسی کی جان محفوظ نہ تھی، اور اس کی باطنی تعلیم کی سحر کاریوں نے دل و دماغ کو اضطراب میں ڈال دیا تھا۔ اس نازک وقت میں (۴۵۰ھ) امام غزالی پیدا ہوئے۔

امام غزالیؒ نے فلسفہ و منطق کی غلط کاریاں آشکار کیں۔ عقلی فیوض سے انکار نہیں کیا، لیکن اس کو اپنی حد سے بڑھنے سے روکا، مذہب کو جامد قیود سے نکالا اور اسے اس کی اصلی سرچشمہ یعنی وجدانی زندگی سے آشنا کرنے کی کوشش کی۔ تصوف کو بے راہ روی سے باز رکھا۔ اشعریت کے جمود کو توڑا اور باطنی تحریک کی گمراہیاں واضح کیں۔

امام صاحب صحیح معنوں میں محی الدین والملّت تھے، ان کی لگائی ہوئی پودے سے آگے چل کر مولانا رومی جیسے صاحب کمال پیدا ہوئے، جنھوں نے خود بادۂ حقیقت سے سرمست و سرشار ہو کر دوسروں کو بھی اس شراب سے مست کر دیا، لیکن یہ سرمستی اور جنون عوام کی سطح سے بہت بلند تھا۔ وہ اس نشہ میں کہیں اور بہک گئے اور وجدانی زندگی شرع و آئین کی قیود سے نکل کر قوم کے دلوں اور دماغوں کو خراب کر گئی۔

زمانہ بھی نازک تھا، زندگی کی مصیبتیں بڑھتی جاتی تھی، مسلمانوں کی سیاسی وحدت پارہ پارہ ہو چکی تھی، آپس کی خانہ جنگی نے ذہن پہلے ہی بےحال کر دیا تھا کہ مغرب سے صلیبی حملوں کا آغاز ہوا اور مسلمانوں کو دو سو برس تک ان کے خلاف نبرد آزما ہونا پڑا، اس صدمہ سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ منگولیا سے تاتاری سیلاب اٹھا۔ اور دنیائے اسلام کو قتل و غارت میں غرق کرتا نکل گیا، ان حالات میں امام غزالی اور مولانا روم کی تعلیمات کا کوئی ٹھوس نتیجہ نہیں نکلا تو تعجب کی کونسی بات ہے۔

ملت اسلام کے قوائے حیات کا اضمحلال پے در پے جنگوں اور بے انتہا خوں ریزیوں کے بعد ایک صحیح اور پختہ ادبی نصب العین کی نشوونما کے لئے نامساعد۔ قوم کی طبیعت پر فرسودہ سست رگ اور زندگی کی دشواریوں سے گریز کرنے والی عجمیت غالب آگئی۔ غزالی اور رومی اصلاحی تحریک کا یہ حشر ہوا۔ ان کے بعد

امام ابن تیمیہ نے "رجوع الی الاسلاف" کی تحریک سے ملت کی رگوں میں تازہ خونِ زندگی پیدا کرنا چاہا' لیکن تقلید اور عدم تقلید کی فروعی بحثوں نے مسلمانوں کی تعمیرِ حیات کی کوششیں کامیاب نہ ہونے دیں اور مسلمان زندگی کا کوئی صحیح اور پختہ نصب العین نہ بنانے پائے۔

(۴)

زوال اور انحطاط کا یہ طویل زمانہ ۶۵۶ھ سے شروع ہو کر ۱۳۳۸ھ میں ختم ہوتا ہے تاتاریوں کی تباہ کاریوں نے مسلمان قوم کی ذہنی زندگی کو ناقابل تلافی صدمہ پہونچایا جس سے وہ پھر سنبھل نہ سکی اور "مسلمان در گور اور مسلمانی در کتاب" کی حالت پہنچ گئی۔ تصوف توہم پرستی کا دوسرا نام تھا' مذہب اندھا دھند دوسرے کے بنائے ہوئے رستہ پر چلنا تھا۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم کی بجائے وہ اکرم سمجھا جانے لگا جو سب سے زیادہ اعمی ہو۔ اجتہاد کا یہ دروازہ بند اور تقلید عین دین قرار پائی۔ عوام زندگی کے شعور سے کلیۃً خالی ہو گئے۔ علماء اور فقہا موجود رہے' لیکن ان کا وقت دربار داری اور مذہبی قیاس آرائیوں میں کٹنے لگا۔ الغرض اسلامی دنیا پر ایک موت کا سا عالم طاری تھا' اور یورپ نئی زندگی کے تازہ خون کے نشہ میں سرشار ہو رہا تھا' زبردست کا کمزور پر چڑھ دوڑنا فطری تھا' مراکش سے لیکر ہندوستان تک تمام کی تمام اسلامی دنیا یورپی شاہ سواروں کے گھوڑوں کے قدموں سے پامال ہو گئی لیکن ع

ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں

اور یہ کیوں نہ ہوتا قدرت کا دستور یہی ہے ؎

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند — می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم نے ملت کی بنائے کہنہ کو بالکل ویران کر دیا اور اس کامل تخریب کے بعد اب صحیح تعمیر کا دور شروع ہوتا ہے ؎

عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے — اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

اس منزل تک پہنچتے پہنچتے ملت اسلامی کے قافلہ کا گذر کن کن مراحل سے ہوا۔ اس کو در "حدیث دیگراں" کے پیرایہ میں اقبال یوں بیان فرماتے ہیں ؎

کون سی وادی میں ہے کونسی منزل میں ہے — عشق بلاخیز کا قافلہ سخت جاں

دیکھ چکا المنی شورش اصلاح دین — جس نے نہ چھوڑے کہیں نقش کہن کے نشاں

حرفِ غلط بن گئی عصمتِ پیرِ کنشت — اور ہوئی فکر کی کشتیٔ نازک رواں

چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب — جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں

ملّتِ رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر — لذّتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں

علماء فقہاء صوفیا مجتہدین کی "عصمت" "حرفِ غلط بن کر رہ گئی" عثمانی خلافت کا طلسم اور ایرانی شہنشاہیت کا ڈھونگ بے نشان ہوگیا، مسلمان کا جسم اس کا دل اس کا دماغ اور اس کی روح روحانی اور سیاسی استبداد سے آزاد ہوگئی، آج لذتِ تجدید سے ہر مسلمان سرمست ہے، کہنہ پرستی کا جنازہ نکل چکا، جمہور ملّت کی رگوں میں زندگی کا خون دوڑنے لگا، دلوں میں ولولے اور دماغوں میں محشرِ انقلاب بپا ہے ؎

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا — سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

طویل اندھیری رات کے بعد اب افقِ اسلام سے نیا آفتاب ابھر رہا ہے، اب ظلمت کو قرار کہاں، نیند کا زمانہ گیا ؎

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی — افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی

دنیا دگرگوں ہے نوجوانوں کے افکار زیر و زبر ہوگئے، محشر کی گھڑی ہے، اور "عالمِ نو" کی تخلیق عمل میں آرہی ہے ؎

مجھ کو تو یہ دنیا نظر آتی ہے دگرگوں — معلوم نہیں دیکھتی ہے تیری نظر کیا

ہر سینے میں ہے اک صبحِ قیامت نمودار — افکار جوانوں کے ہوئے زیر و زبر کیا

روحِ مسلماں میں یہ اضطراب کیوں ہے اور اس سے کیا انقلاب ہونے والا ہے، یہ راز کون حل کرے؟

روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب — رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا — گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

اس رازِ خدائی کی پردہ کشائی مصلحتِ زمانہ کے خلاف ہے، یہ باتیں ابھی محرمانِ راز تک ہی رہیں تو مناسب ہے ؎

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں — میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

پردہ اٹھادوں اگر چہرۂ افکار سے — لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

اس عالمِ نو کی بنیاد پڑ چکی ہے، افکارِ تازہ کی نمود تمہید ہے جہانِ تازہ کی تخلیق سے ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود

کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

(باقی باقی)

متحدہ قومیت اور مسلمان لیڈران

جناب عبدالوحید خاں صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ لکھنؤ

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں　　عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

تنقید خیالات و افکار کی اصلاح کا بہترین ذریعہ ہے، لیکن بدقسمتی سے اکابر پرستی اور کورانہ تقلید کی رو میں ہمارے ناقدین کرام شخصیتوں پر اصولوں کو جس بیدردی سے قربان کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں وہ قابلِ افسوس اور عوام میں انتشارِ افکار کا موجب ہے۔

اسی قسم کا ایک طویل مضمون "الفرقان" ماہ محرم صفر میں جناب مولوی عبدالحفیظ صاحب بلیاوی کے نام سے (جو ادارہ "الفرقان" کے ایک رکن[1] ہیں) "ہمارے ماہرین سیاست کی قلابازیاں" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، جس میں اس حقیر کو درخورِ اعتنا سمجھتے ہوئے خاص طور سے ہدفِ ملامت بنانے کی کوشش کی ہے۔

ہر انسان پر علماء کا احترام واجب ہے، دین کو نقصان پہونچانے کے لئے علماء کی مخالفت نہ صرف گناہِ عظیم بلکہ کھلا الحاد ہے۔ جس پر خاموشی گناہ اور مدافعت لازم ہے، اسی طرح علماء کی ان لغزشوں کی حمایت بلکہ ان پر خاموش رہنا بھی برا اور تعلیمات قرآنی کے خلاف ہے، جن سے اسلام کے بنیادی اصولوں پر زد پڑتی ہے اور عوام میں گمراہی کا اندیشہ ہو! اتخذوا احبارھم ورھبانھم ارباباً من دون اللہ لیکن ہر حمایت اور مخالفت کا ایک ایجابی اور اثباتی پہلو بھی ہوتا ہے۔ جس تخریب کے سامنے تعمیر نہ ہو، جس لا کے ساتھ الا نہ ہو، اس سے بڑا فساد کوئی نہیں، جو قوم یا جماعت اپنی زندگی کی بنیاد محض عدم اور نفی پر رکھتی ہے،

---

[1] یہ واضح رہے کہ "الفرقان" "ترجمان القرآن" کی طرح "جماعتِ اسلامی" کا ترجمان اور حامی ہے۔ اس کے اڈیٹر مولانا منظور احمد صاحب نعمانی جماعت مذکورہ کے "سابقون الاولون" میں سے ہیں، لیکن زیرِ نظر مضمون ان کی جماعت کے بنیادی اصولوں کے بھی خلاف ہے اور ان افراد کی حمایت میں لکھا گیا ہے جو متحدہ قومیت کے داعی ہیں اور جن کے ساتھ دو سال تک "ترجمان القرآن" برسرِ پیکار رہ چکا ہے۔ ۱۲

اور جس کا مطمح نظر صرف دوسروں کی "قلابازیوں" کا شمار کرنا ہو اس کی زندگی موت سے بدتر ہے۔

ہمارے فاضل مضمون نگار کی یہ بڑی قابلِ قدر خدمت ہوتی اگر وہ ان الزامات اور اعتراضات کا جو جمعیۃ العلماء کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں تسلی بخش جواب قرآنی روشنی میں دیکر ان کی اسلامی حمایت کا ثبوت دیتے اور ارکان جمعیۃ کی موجودہ سیاسی پالیسی کا ان "زائرانِ حریم مغرب" کے آج کے طرزِ عمل سے مقابلہ کرکے دنیا کو بتلاتے کہ کونسا راستہ صحیح اور قابلِ اتباع ہے، مگر افسوس انھوں نے اس نابینا بڑھیا کی طرح جو ہر شخص کی کمر اپنی ہی طرح جھکی ہوئی دیکھنا چاہتی ہے، دوسروں کی عیوب شماری میں ہی علماء کی مدافعت کا حق ادا کرنے کی ناکام کوشش کی۔ انھوں نے اثباتی طور سے علماء جمعیت کی حمایت میں کوئی دلیل پیش کرنے کی جرأت نہیں کی، ان کی سیاسی غلطیوں کے وہ معترف معلوم ہوتے ہیں، مگر ان لغزشوں کے وزن کو کم کرنے کیلئے وہ دوسروں کی موجودہ نہیں بلکہ گذشتہ جرائم کی فہرست تیار کرتے ہیں۔

ہمارے مکرم ناقد کی ابتدائی مگر سخت گمراہ کن غلطی یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان کی سیاست میں حصہ لینے والے مسلمان کو "علماء اور لیڈران" کی دو جماعتوں میں تقسیم کرکے عوام کے جذبات سے فائدہ اٹھانا چاہا، حالانکہ جب سے ہندوستان کی موجودہ سیاست کی تاریخ مرتب ہوسکی ہے، کوئی دور ایسا نہیں گذرا جس میں مسلمان "علماء" اور "غیر علماء" کے دو مختلف اسکول بنا کر باہم متصادم ہوئے ہوں۔ غدر کے بعد سے آج تک مسلمانانِ ہند دو مکاتیب خیال میں منقسم رہے ہیں، ایک وہ جو مسلمانوں کی علیحدہ جماعت کی تنظیم کا حامی اور کانگریس میں شرکت اور متحدہ قومیت کے خلاف رہا، دوسرا وہ جس نے ہندوستان کے تمام باشندوں کو ایک قوم سمجھتے ہوئے متحدہ قومیت کا سبق دیا اور ہندو مسلمانوں کی ایک جماعت اور مشترکہ حکومت کے حصول میں ساعی رہا، اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں جماعتوں میں بہت سے افراد مختلف اوقات میں حالات کے ساتھ بدلتے رہے، مگر ذہنی اعتبار سے مسلمانوں میں آج تک یہ تقسیم قائم ہے علماء اور غیر علماء کی آج بھی کوئی تقسیم موجود نہیں اول الذکر جماعت میں جہاں مسٹر جناح اور ان کے رفقائے کار شریک ہیں وہیں مولانا حسرت موہانی علمائے فرنگی محل، علمائے بدایونی، علمائے کانپور حضرت مولانا اشرف علی صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی وغیرہ یا تو باقاعدہ شریک ہیں یا مؤید ہیں۔ اسی طرح دوسرا گروہ جہاں ایک طرف جمعیۃ العلماء اور مجلس احرار پر مشتمل ہے، وہیں خان بہادر اللہ بخش جیسے سرکار پرست "دینِ الٰہی" کے حامی ڈاکٹر محمود

اور مسٹر آصف علی، مذہب کا استہزار کرنے والے ملحدین اور "انگارہ" کے مصنفین اور سوشلسٹ حضرات بھی شامل ہیں۔ یہاں تک کہ جمعیتہ العلماء ہند کے صدر استقبالیہ ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری تک ہو سکتے ہیں، جن کے عالم ہونے کی سند شاید ادارہ "الفرقان" سے عطا کی گئی ہو اس لئے ماہرین سیاست کے کارناموں اور ان کی قلابازیوں کو علماء کی سیاسی غلطیوں کے مقابلے میں پیش کرنا اصولاً غلط ہے۔ اسی طرح رحمت اللہ بیسانی اور بدرالدین طیب جی کو علماء کے مقابل پیش کر کے ان کے جرائم کو مسلم لیگ کے موجودہ لیڈروں سے وابستہ کرنا بلیاوی صاحب کی خوش فہمی کی دلیل ہے یہ حضرات اسی مکتب خیال سے تعلق رکھتے تھے جس سے آج جمعیتہ العلماء کے ارکان وابستہ ہیں۔ یہ لوگ اگر آج زندہ ہوتے تو مسٹر آصف علی اور ڈاکٹر سید محمود کے ہمنوا ہوتے، نہ کبھی کسی مؤرخ نے ان لوگوں کو مسلم زعمائے ہند کی کسی صف میں جگہ دی ہے، پس درحقیقت اسلامی سیاست میں کوئی تصادم علماء اور مسلم لیڈروں میں نہیں ہے، جو اختلاف ہے وہ کانگریس اور مسلم لیگ میں ہے جمعیتہ العلماء سے بھی مسلم لیگ کا براہ راست کوئی جھگڑا نہیں بلکہ کانگریس کی وجہ سے ہے اس لئے میری کتاب میں جہاں کہیں علماء پر تنقید ہے وہ یا تو اوس زمانے کے علماء[1] پر ہے جو اسلامی حکومت کے زمانے میں جاہ و منصب پرستی کی وجہ سے فتنوں کا باعث ہوئے اور جن کے استبداد کے سبب حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ و حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ وغیرہم کو بہت سے مصائب کا سامنا کرنا پڑا، یا علمائے جمعیتہ پر، نہ کہ عام طور سے تمام علماء پر، حضرت مجدد الف ثانیؒ سے لیکر حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ مولانا محمد قاسمؒ اور حضرت شیخ الہندؒ تک قریب قریب تمام علماء نے دین الٰہی کے اثرات اور متحدہ قومیت کے تخیل کی مخالفت کی، یہاں تک کہ شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ نے اللہ اکبر کے بجائے "گاندھی جی کی جے" کے

---

[1] میری کتاب "مسلمانوں کا ایثار" کے صفحہ ۱۳ کے فٹ نوٹ، حق پرست اولیا ہر وقت موجود رہے لیکن زمانے کی کثافتوں کی بنا پر وہ گوشہ نشین رہے، اس لئے جہاں کہیں علماء کی ناگفتہ بہ حالت کا ذکر ہے اس سے مراد انھیں علماء سے ہے جو امور دینوی اور سیاسی میں برابر حصہ لیتے تھے" کا حوالہ فاضل مضمون نگار نے دیکر غلط نتیجہ نکالا ہے، یہاں مراد دورِ اکبری کے علماء سے ہے نہ کہ جمعیتہ العلماء کے ارکان سے۔ ۱۲

نعروں کو بھی گوارا نہ کیا' ان علمائے کرام کو جمعیۃ العلماء کے ارکان کے خیالات سے وابستہ کرنا خود فریبی بلکہ خود آفرینی سے کم نہیں۔

اگر مسلم لیگ کے زعماء کی (موجودہ نہیں بلکہ) گذشتہ سیاسی غلطیوں کے ثابت کر دینے سے ارکان جمعیۃ کی اس غلط رہنمائی کی تلافی ہو سکتی ہے جو مسلمانان ہند کو ہندو اکثریت کے تابع ہونے پر مجبور کرتی ہے' اور جس کی بدولت دیوبند کے صدر مدرس اور دہلی کے مفتی اعظم مسلمانوں کی امامت کے منصب پر فائز ہونے کے بجائے جواہر لال کی اقتدا پر مجبور ہیں' اور امام الہند بھی گاندھی جی کی رہنمائی' اتحاد اور ڈسپلن میں ہندوستان کی نجات دیکھتے ہیں[۵۱] تو ہم اپنے محترم ناقد کو مبارکباد دیتے ہیں، مسلم لیگ کے لیڈروں نے اپنی معصومیت کا کبھی دعویٰ نہیں کیا، مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے بارہا خود مسٹر جناح کی بے شمار تقریروں اور تحریروں میں ببانگ دہل اس امر کے اعتراف کا اعلان کیا جا چکا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کی تمام کوششیں اور ہندوستان میں ایک مشترکہ حکومت کی تمام مساعی غیر فطری اور غیر اسلامی تھیں" ہماری سیاست[۵۲] کی پوری عمارت جو ۱۹۳۹ء سے قبل تک تیار کی گئی تھی قابل انہدام ہے' ان لیڈروں نے نہ صرف اس عمارت کو فرسودہ قرار دیا بلکہ اس کو منہدم کرنے کا اعلان کر کے نئی عمارت کی تیاری بھی شروع کر دی ؎

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی　　روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب (اقبالؒ)

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک کی ناکامی کے بعد سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نفاذ تک مسلم زعمائے ہند نے (جنہیں علماء اور غیر علماء سب شامل ہیں) اسلامی سیاست کی تشکیل میں بیحد غلطیاں کیں ایک ہزار برس کے غیر اسلامی و ملوکیت پرور نظام سے وابستہ رہنے کی وجہ اور ملکی آزادی کے جذبہ سے متاثر ہو کر مسلمانان ہند نے برادران وطن کے ساتھ اتحاد اور سمجھوتہ کرنے کی غرض سے "رواداری[۵۳]" وسعت قلب اور فراخدلی" کے مظاہرے میں حد سے تجاوز کیا۔

---

۵۱ ملاحظہ ہو خطبۂ صدارت مولانا آزاد رام گڈھ ۵۲ ملاحظہ ہو مسٹر جناح کی تقریریں و تحریریں بزبان انگریزی۔ ۱۲

۵۳ سرسید کو قوم پرست طبقہ فرقہ پرور اور آزادی کا دشمن قرار دیتا ہے (ملاحظہ ہو مسلمانوں کا روشن مستقبل) اس کو غلط ثابت کرنے کیلئے سرسید کی وہ تحریریں ہیں نے اپنی کتاب میں پیش کی تھیں جن کا حوالہ جناب ناقد نے دیا ہے ان تحریروں کا وہی مفہوم ہے جو آج جمعیۃ العلماء کہتی ہے' لیکن غریب سرسید آزادی کا دشمن' اور یہ حضرات آزادی پرور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندو مسلم مفاہمت کی کوششیں رواداری پر مبنی تھیں جس طرح خلافت کے زمانہ میں جامع مسجد میں دہلی کا تقریر کرنا' مگر یہ ضروری نہیں کہ رواداری اسلامی حیثیت سے جائز بھی ہو۔ ۱۲

اوٗنھوں نے غلطی سے ہندو مسلمانوں کو ایک ہی پیرہ کی دو آنکھیں تسلیم کیا حالانکہ کفر و اسلام کو ملا کر ایک قومیت کی تشکیل اتنی ہی ناممکن ہے جتنی آم اور پیپل کے قلم سے بار آوری -

علامہ اقبال رحؒ نے سب سے پہلے وطنیت کے بت کے خلاف آواز بلند کی اور تمام عمر اس کے خلاف جہاد کیا چونکہ مولانا محمد علی رحؒ نے اس وقت تک وطنیت کے غلط نتائج کا تجربہ نہ کیا تھا اس لئے آپ نے وہ مضامین لکھے جن کا حوالہ مضمون مذکور میں دیا گیا ہے، لیکن جس حقیقت کو علامہ اقبال رحؒ نے اپنی غیر معمولی بصیرت اور مطالعہ اسلام کی وجہ سے ۱۹۱۲ء میں فاش کر دیا تھا ۱۹۲۹ء میں خود مولانا محمد علی رحؒ کو اسے تسلیم کرنا پڑا، لہٰذا آپ نے فرمایا قومیت کو منتہائے نظر بنانا یورپ کی تقلید جامد ہے اور وطنیت خود وثنیت یعنی بت پرستی ہے اسلام وطن پرور ہے، وطن پرست نہیں،

مولانا عبدالحفیظ صاحب کے افلاس تخیل کا نتیجہ اس سے چلتا ہے کہ اوٗنھوں نے مولانا محمد علی مرحوم اور علامہ اقبال رحؒ کے معمولی وقتی اختلاف کو پیش کر کے علامہ اقبال رحؒ کی پوزیشن کو کم کرنے کی کوشش کی ہے غالباً ان کو یہ نہیں معلوم کہ جس نے علامہ اقبال رحؒ کے متعلق وہ الفاظ لکھے تھے جن کو انھوں نے نقل فرمایا ہے اسی نے علامہ اقبال رحؒ کے متعلق یہ بھی لکھا تھا "علامہ اقبال رحؒ ہندوستان میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا علمبردار شاعر ہے" اسلامی ہندوستان اس سے زیادہ کسی کا مقروض نہیں ہے جتنا کہ اس شرمیلے منکسر المزاج پنجابی بیرسٹر کا - اس کا نام اردو بولنے والی دنیا میں ہر شخص کی زبان پر ہے' میں ہمیشہ اس کا عاشق اور دل دادہ رہا ہوں اگر کوئی اقبال رحؒ کی دلدادگی میں میری برابری کر سکتا تھا بلکہ سبقت لے سکتا تھا تو وہ میرے بھائی شوکت علی تھے جن کی تقریر تو بذات خود بہت سست ہوتی تھی، مگر اقبال رحؒ کے اشعار پُرجوش سے وہ لوگوں کے دلوں میں ابھار پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے، مجھے اس پر بہت رشک آتا تھا" (میری زندگی بزبان انگریزی از مولانا محمد علی صفحہ ۱۲۶)

اسی طرح مسٹر محمد علی جناح بھی ایک عرصہ تک کانگریس میں شریک رہے' کانگریس کا تعمیر کردہ جناح ہال بمبئی میں ان کی ان خدمات کا شاہد ہے جو انھوں نے ہندوستان کے لئے انجام دیں مگر ان کا یہ طرزِ عمل یقیناً قابل صد رشک ہے کہ جب انھوں نے یونیٹی کے پردے میں ہندو امپیریلزم کو مسلمانوں پر مسلط ہوتے دیکھا تو وہ پوری قوت اور کامل اعتماد کے ساتھ اسلامی سیاست کی تعمیر نو میں ہمہ تن مصروف ہو گئے اور جبکہ ارکانِ جمعیتہ پشاور سے مدراس تک متحدہ قومیت کی

کی تبلیغ اور کانگریس کے پرچار میں دورے کر رہے تھے اسی بندۂ خدا نے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے اور ان کو "بنیان مرصوص" بنانے کے لئے دن رات ایک کر دیا لیکن برا ہو شخصیت پرستی کا۔ اس کار حق کو سراہنے کے بجائے حامیان "جمعیتہ" نے اس کو بھی "قلابازیوں" سے تعبیر کیا۔

لیکن ان غریب مسلم لیڈروں کی "قلابازیوں" کو شمار کرتے وقت جو پریشانی ایک متلاشی حق کو لاحق ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جب علماء کرام نے میدان سیاست میں ان "قلابازیوں" کا مظاہرہ دیکھا تو کیوں ان کے خلاف نعرۂ حق بلند نہ کیا، کس چیز نے ان کو وطنی قومیت اور مشترکہ حکومت کے خلاف آواز بلند کرنے سے باز رکھا، کیوں[1] حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک کی ناکامی کے بعد انھوں نے مسلمانانِ ہند کے سامنے قرآنی سیاست کا باب کھولنے کے بجائے جمعیتہ العلماء کے پلیٹ فارم سے متحدہ قومیت کی تائید کی۔ انھوں نے کیوں ۱۹۱۶ء کے پیکٹ کی جو مسلم لیڈروں کی فرد جرم کا سب سے بڑا جرم بتایا جاتا ہے مخالفت نہ کی بلکہ یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو آغا خاں جیسے رجعت پسند لیڈر کی صدارت میں کیوں ان چودہ نکات کو منظور کرایا جو اصل میں ۱۹۱۶ء کے پیکٹ کا لازمی نتیجہ تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس پیکٹ سے مسلم اکثریت کے صوبوں کو نقصان پہونچا، اور آج خود مسلم لیگ کو اس کا خمیازہ اٹھانا پڑ رہا ہے لیکن

---

[1] مولانا عبدالحفیظ صاحبؒ نے ہمارے اس دعوے کی بلادلیل تردید کرنے کی کوشش کی ہے کہ علماء کو ہندوستانی سیاست میں حجروں سے باہر لانے والے مولانا محمد علی مرحوم تھے" انھوں نے کچھ بزرگوں کے نام پیش کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ علماء پہلے سے سیاست میں داخل تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی سے لیکر شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے زمانے تک بعض علماء کرام نے محض انفرادی حیثیت سے باطل کا مقابلہ کیا، اور بیشتر اوقات ان حضرات کو خود علمائے ہند کے فتووں کا مقابلہ کرنا پڑا بیشک تاریخ ہند ایک تحریک "جہاد سرسید احمد شہیدؒ" سے واقف ہے جو اگرچہ ناکام ہوئی مگر اس کے اثرات اب تک باقی ہیں، اس کے بعد علماء آزادی پسند جماعتی حیثیت سے مسجد کانپور کے واقعے تک بلکہ ۱۹۱۹ء تک سیاست سے علیحدہ رہے اس کی تفصیلات ہماری زبانی نہیں، بلکہ خود علمائے جمعیتہ کے سرتاج حضرت الامالہند کی مشہور تصنیف "تذکرہ" میں ملاحظہ فرمائیے بلاشک شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ اور مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محل ۱۹۱۹ء سے قبل بھی انفرادی حیثیت سے سیاسیات میں دلچسپی لیتے رہے اور ان دونوں بزرگوں نے اپنا اپنا حق ادا کیا۔ ۱۲

اس معاہدے سے پہلی مرتبہ مسلمانوں کے ملّی جداگانہ وجود کو ہندوؤں نے تسلیم کر لیا، جمعیۃ العلماء نے کبھی اس پیکیٹ کی تردید میں کوئی قدم نہیں اٹھایا بلکہ متذکرۂ بالا موجودہ نکات کی تجویز کو مفتی کفایت اللہ صاحب ہی نے پیش فرمایا تھا، صرف یہی نہیں کہ ان علماء نے مسلم لیڈروں کی غلطیوں کی ہم آہنگی کی اور اگر اختلاف بھی کیا تو متحدہ قومیت کی حمایت میں، بلکہ وہ آج اسی "تحفظاتِ حقوق و تعینات نشست" کے فرسودہ راستے پر گامزن ہیں جس کو مسلم لیگ کے لیڈر چھوڑ چکے ہیں تین سال قبل جب مسلم لیگ مسلمانوں کے "تحفظات" کا مطالبہ کرتی تھی تو یہ حضرات مضحکہ اڑانے میں پیش پیش تھے، لیکن اب جبکہ مارچ ۱۹۳۹ء کے بعد مسلم لیگ نے حکومت میں علیحدہ مساوی حصے کا مطالبہ شروع کیا ہے تو یہ اس کی "گرد کارواں" کو اپنی منزل بنا کر آزاد مسلم بورڈ میں انھیں تحفظات کا مطالبہ کرتے ہوئے ندامت محسوس نہیں کرتے، آج جبکہ مسلم لیگ متحدہ قومیت کے تخیل تک کو دفن کر کے شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہؒ ایسے برگزیدہ حضرات کی روحوں کو خوش کر چکی ہے، یہ بزرگ ابھی تک وطن پر قائم شدہ قومیت ہی کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہیں۔ عمل کی یکسانیت زندگی کا ایک قابلِ تقلید پہلو ہے، لیکن اگر جون کے مہینے میں دسمبر کے کپڑے استعمال کرنا باوجود عمل کی یکسانیت کے احمق پن ہے تو دشمن کے سوئے نیت اور بد ذہنیت کے علم کے بعد متحدہ قومیت[1] کا راگ الاپنا سب سے بڑا ضدی پن اور بیجا ہٹ ہے۔ مگر حسن ظن کی داد کس طرح دی جائے کہ ہمارے ناقد صاحب کو اس یکسانی اور ہمواری میں اب بھی بصیرت ہی بصیرت نظر آ رہی ہے[2]۔

چونکہ علمائے جمعیۃ کی ہمواری اور یکسانیت کا ذکر آ گیا اس لئے صرف گذشتہ چند سال کی یکسانیتِ عمل پر سرسری نظر ڈال لیجئے۔

---

[1] اصل میں تو مسلم لیگ کی کوششوں سے جداگانہ حق انتخاب کا حصول ہی متحدہ قومیت پر ضرب کاری تھا ۱۲

[2] اس سے زیادہ تضاد دیکھنے میں نہیں آیا کہ "الفرقان" عرصہ تک مضامین ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے شائع کرتا ہے جو متحدہ قومیت کے خلاف لکھے گئے تھے آج اسی پرچے میں متحدہ قومیت کے عمل کی یکسانیت میں بصیرت نظر آ رہی ہے — ۱۲

جب کہ مسلم لیگ کا نصب العین "آزادی کامل" نہ تھا اور مسٹر جناح "قائداعظم" نہ ہوئے تھے، جمعیتہ العلماء کے ارکان نہ صرف مسلم لیگ کے رکن تھے بلکہ خود مسٹر جناح کو صدر بنانے اور مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے تمام اختیارات سپرد کرنے میں پیش پیش تھے جبکہ مسٹر جناح اردو میں تقریر بھی نہ کرسکتے تھے، جمعیتہ العلماء کے اجلاس میں مسٹر جناح کا استقبال ضروری سمجھا جاتا تھا اور ان کی تقریر کو نہ سمجھنے کے باوجود انگریزی زبان میں سنا جاتا تھا، لیگ جبکہ تجاویز پاس کرنے اور چند آدمیوں پر مشتمل محض ایک کاغذی جماعت تھی[۱]، اس وقت انتخابات میں لیگ کی مخالفت کرنے والوں کو دوزخ کی دھمکیاں اور بے دینی کے فتوے دیئے گئے لیکن آج جبکہ دوست اور دشمن معترف ہیں کہ مسلم لیگ نے بکھرے ہوئے شیرازے کو ایک جگہ مرکوز کردیا ہے اور اس کا نصب العین اسلام سے زیادہ قریب ہے، ہمارے بزرگان دین اس کو شجرِ ممنوعہ قرار دے رہے ہیں۔

آج مسٹر جناح کی قیادت پر اعتراض ہے کہ وہ شیعہ ہیں (حالانکہ وہ غریب، سنیوں کے ساتھ باالجماعت عیدین وجمعہ کی نمازیں ادا کرتا ہے) لیکن یہی بزرگ اسمٰعیلیوں کے سردار آغاخاں کی صدارت میں ۱۹۲۹ء میں مسلم تجاویز کو خود پیش کرتے ہیں۔ انھیں حضرات نے ۱۹۳۴ء میں یونٹی بورڈ کے کھلے اجلاس میں جو گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا مرکزی اسمبلی کے امیدواروں کے انتخاب کے وقت راجہ صاحب سلیم پور کی ذات میں اعتماد کا ووٹ مولانا احمد سعید صاحب کی تحریک پر پاس کیا، مظہر علی اظہر صاحب شیعہ ہونے کے باوجود مجلس احرار کے جنرل سکریٹری اور اجلاس لکھنؤ کے صدر ہوسکتے ہیں مسلم لیگ میں خطاب یافتہ عناصر جس طرح مسٹر جناح کی قیادت کے سامنے زبان بند ہیں۔ وہ سب کو معلوم ہے۔ یہاں تک کہ مسٹر جناح پر ڈکٹیٹر ہونے کا طعن تک اسی لئے دیا جاتا ہے مگر جمعیتہ العلماء و احرار کے علماء مسلم لیگ میں امام بن کر نہیں شامل ہوسکتے اور خان بہادر اللہ بخش کی صدارت وقیادت میں "آزاد مسلم بورڈ" میں مقتدی بن کر رہ سکتے ہیں۔ فضل الحق صاحب کو مسلم لیگ نے صرف اسی لئے علیحدہ کیا کہ انھوں نے وائسرائے کی توسیع شدہ کونسل کی رکنیت سے استعفا دینے

---

[۱] ۱۹۲۲ء کے بعد سے ۱۹۳۶ء کے آخر تک مسلم لیگ ایک برائے نام جماعت رہ گئی تھی تفصیلات کے دیکھئے کتاب مسلمانوں کا ایثار۔۔ ۱۲

کے سلسلے میں بغاوت کی مگر مسلم لیگ کے اخراج اور وائسرائے کی کونسل میں ان کی دوبارہ نامزدگی کے بعد اب وہ علماء کانگریس کے دوست دہمنوا اور آزاد بورڈ میں ان حضرات کے رفیق کار ہیں۔ ع

ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے الیکشن مینی فسٹو میں تمام علمائے جمعیۃ کے دستخط سے ۱۹۳۶ء میں حکومت سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ فوج میں ہندوستانی عنصر زیادہ سے زیادہ رہے لیکن جب کانگریس اور ہندو مہاسبھا نے اس خیال سے کہ فوج میں مسلم تناسب کبھی آئندہ انقلاب میں مہلک ثابت ہو سکتا ہے صرف صوبہ پنجاب میں فوجی بھرتی کے خلاف شورش مچائی اور مسلم لیگ نے اس مینی فسٹو کی رو سے فوجی بل کی حمایت کی تو یہ تمام حضرات خلاف[۵۱] تھے۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ ایران فوج بھیجنے کے سلسلے میں جمعیۃ العلماء بالکل خاموش رہی جبکہ مسلم لیگ نے کونسل اور ورکنگ کمیٹی میں باقاعدہ احتجاج اور اس طرز عمل کے خلاف اظہار نفرت کیا لیکن جمعیۃ العلماء کی سب سے زیادہ دلچسپ یکسانیت عمل کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ تحریک خلافت کے زمانے میں اسمبلیوں کے بائیکاٹ کا فتویٰ بڑے شد و مد سے دیا گیا اسمبلی کی رکنیت کو حرام بتایا گیا، لیکن جب کبھی کانگریس نے اسمبلی میں شرکت کا ارادہ کیا تو ہمارے انھیں علماء نے پوری جدوجہد سے اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیا۔ بہرحال ان کی "ہموار ی خیال مسلم" ہے۔

افسوس یہ ہے کہ مسلم لیگ کے لیڈروں کے پرائیویٹ کیرکٹروں تک جمعیۃ العلماء کے حامی اخبارات نے نہ بخشا لیکن امام الہند "وارد ہا آشرم" میں رسوئی میں بیٹھکر ہندو طریقے سے بھوجن[۵۲] تک کریں اور اپنے خطبۂ صدارت رام گڈھ میں صاف اعلان کریں۔ کہ مسلمانوں کو اس اسلام کا خواب نہ دیکھنا چاہیئے جس کو وہ عرب اور ایران سے ساتھ لائے تھے" جب بھی وہ جمعیۃ العلماء کے اجلاس لاہور میں پوری

---

[۵۱] یہ واضح رہے کہ مولانا محمد علی مرحوم والا ریزولیوشن جس پر کراچی کا مقدمہ چلایا گیا اس فوجی بل سے بالکل مختلف تھا۔ اس کے لئے مولانا شوکت علی مرحوم (جو مقدمہ کراچی کے اداکاروں میں سے ایک تھے) کی پوری تقریر پڑھیئے۔ ع تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں — ۱۲

[۵۲] دیکھئے ہندوستان ٹائمز یکم اگست ۱۹۳۸ء تصویر مولانا آزاد جس میں وہ نائڈو کے ساتھ علیحدہ بیٹھے ہوئے "چوکے" پر بھوجن کر رہے ہیں — ۱۲

رہنمائی کا شرف عطا کر سکتے ہیں۔

ہم کو افسوس ہے کہ حامیان جمعیتہ و احرار حسن عقیدت میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں۔ کہ وہ علماء کی اس منافقانہ روش پر غور نہیں فرماتے جو انھوں نے کانگریس کے ساتھ اختیار کر رکھی ہے۔ ان حضرات کو کس طرح مسلم جماعتوں کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب کبھی کانگریس کو مسلم لیگ کے خلاف مسلمانوں کی آواز کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے تو بیچارے شوکت اللہ انصاری صاحب فوراً ایک کانفرنس طلب کر لیتے ہیں، اور ہمارے قابل احترام کانگریسی علماء اپنی عظمت و مرتبت کو درگاہوں میں چھوڑ کر ان تجاویز کی تائید میں دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں جنکے مسودے بذریعہ تار آنند بھون سے بن کر آتے ہیں۔ انسوس!

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی　　　اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی (اقبالؔ)

امید ہے کہ ادارۂ "الفرقان" اس موضوع پر صبر و صداقت کے ساتھ غور و فکر کرے گا ؎

حق گوئی و بے باکی آئین جوانمرداں　　　اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

آخر میں اپنے محترم ناقد جناب مولوی عبدالحفیظ صاحب بلیاوی سے نہایت ادب کے ساتھ اتنا اور عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ اب مسلم لیگ سے نفرت دلانے کا زمانہ نہیں رہا قائد اعظم کے کیرکٹر پر خواہ مخواہ حملہ کرنے، ان کو بد دین اور شیعہ کہہ کر مسلمانوں کو ان سے متنفر کرنے کا وقت گذر گیا، اور پھر سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ بے وقت کی راگنی آپنے کیوں الاپی اس وقت اس نقارے کی کیا ضرورت تھی، آپ کے زیادہ اور آپکے مضمون سے کہیں زیادہ اب مسلم لیگ کا ایک ایک حامی اس بات سے واقف ہے کہ پہلے مسلم لیگ کیا تھی اور اب کیا ہے جو کانگریسی علما کسی خاص غرض کی بنا پر کانگریس میں شریک ہو کر مسلم لیگ پر طعنہ زنی کر رہے ہیں ان کو دنیائے اسلام کس نظر سے دیکھتی ہے، جمعیتہ کتنے ہی جلسے مسلم لیگ کے خلاف کرے کانگریس کتنا ہی زور اس کی مخالفت میں لگائے، احرار کتنا ہی سر ماریں لیکن کوئی عقل سلیم رکھنے والا مسلمان ان کی آواز پر کان نہیں لگا سکتا یہاں تک کہ گورنمنٹ بھی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتی، تمام دنیا نے مان لیا کہ مسلم لیگ ہندوستان کی واحد جماعت ہے جو صحیح معنی میں مسلمانان ہند کی نمائندہ ہے اور اہل اسلام کے حقوق کی سچی محافظ، مسلم لیگ کے مسلمہ قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح ہیں۔ خدا کے لئے اب تو ان جھگڑوں کو چھوڑیئے مخالفت کا زمانہ گذر گیا، آئیے ہم یکجہت و ہم آہنگ ہو کر مسلم لیگ کی نمائندگی کا سچا حق ادا کریں ؎

اٹھ کہ خورشید کا سامان سفر تازہ کریں　　　نفس سوختۂ شام و سحر تازہ کریں (اقبالؔ)

حقائق وعبر

(۱) پاک و ناپاک

جو شخص حق و صداقت کی راہ کو چھوڑ کر باطل کا راستہ اختیار کرلیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کا نور بصیرت اور فہم و فراست کس طرح سلب کرلیتا ہے۔ اس کی عبرت انگیز مثال جناب ابوالکلام صاحب آزاد کی زندگی میں ملے گی۔ کانگریس کے الٰہ آباد کے اجلاس میں مسٹر راجگوپال آچاریہ نے جب پاکستان کی حمایت میں اپنا ریزولیشن پیش کیا تو جناب آزاد نے اس کی پوری شدومد سے مخالفت کی۔ انھوں نے نہایت بلند آہنگی سے فرمایا کہ نظریۂ پاکستان اسلام کے خلاف ہے! جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے یہ سب سے پہلا موقعہ تھا کہ جناب راشٹرپتی صاحب نے پاکستان کے متعلق اس قسم کا فتویٰ صادر فرمایا ہو۔ دنیا ہمہ تن گوش تھی کہ اب سنیں کہ اتنے بڑے دعویٰ کی دلیل کیا دی جاتی ہے۔ جناب آزاد نے دوسرے ہی فقرہ میں وہ دلیل پیش کردی فرمایا کہ پاکستان کا مطلب یہ ہے کہ وہ خاص خطہ تو پاک ہوگا اور باقی سب ناپاک ہونگے! ہمارا خیال ہے کہ مسلمانوں کو تو چھوڑ دیجئے خود سنجیدہ مزاج ہندو بھی جناب صدر کانگریس کی اس طفلانہ دلیل پر بمشکل ہنسی تھام سکے ہونگے۔ پاکستان کے اسلامی اور غیر اسلامی ہونے کے سوال کو تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ دیجئے۔ صرف اس دلیل کے بودے پن پر غور کیجئے کشمیر میں ایک شہر ہے "اسلام آباد" جناب آزاد کے اس ارشاد کے مطابق مسلمانوں کو چاہیئے کہ اس بستی کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں کہ بستی والوں نے اپنے شہر کے سوا باقی مقامات کو غیر اسلامی قرار دے رکھا ہے! امرتسر کے باہر ایک نئی بستی آباد ہوئی ہے جس کا نام ہے شریف پورہ۔ جناب آزاد کے منطق کی رو سے تمام شریف آدمیوں کو اس بستی کے خلاف جہاد کا اعلان کردینا چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو شریف سمجھتے ہیں اور باقی سب کو غیر شریف خیال کرتے ہیں! ہم حیران ہیں کہ جناب آزاد کی اس بچپن کو کس چیز پر محمول کریں۔ اس کا تو ہمیں اندازہ تھا کہ ان کا نور بصیرت ان سے چھن چکا ہے لیکن نہ اس حد تک کہ جس پر علم روئے۔ عقل ماتم کرے اور دنیا ہنسے بہ تم درد نا ک سفل سافلین کی کیسی دردناک تعبیر ہے!

اور پھر اس شپرہ چشمی کا کیا علاج کہ جسے وہ علاقہ بھی پاک نہ نظر آئے جس میں حکومت الٰہیہ کے قیام

کے امکانات وجودکوش ہوں۔ جناب راشٹرپتی صاحب کے نزدیک اب آنند بھون اور سیوا گرام کے سوا اور کون سا مقام پاک قرار دیا جاسکتا ہے! جب ان کے نزدیک "روح عظیم" گاندھی جی کے پیکر میں ہے تو "ارض مقدس" بھی تو وہی خطہ ہوگا جسے اس روحِ عظیم کے پوتر چرنوں کو چھونے کی سعادت حاصل ہوگی
آہ کس قدر عبرت کا مقام ہے! سچ فرمایا تھا ترجمان حقیقت نے کہ

دین ودانش را غلام ارزاں دہد تابدن را زندہ دارد جاں دہد

الہ آباد کے اس واقعہ سے ایک فائدہ تو ضرور ہوا۔ ہمارے نیشلسٹ "علمار کرام" مسلمانوں کو ہمیشہ یہ دھوکا دینے کی کوشش کیا کرتے تھے کہ بابا! ہم لوگ کانگریس میں شریک اس لئے ہوئے ہیں کہ مسلمانوں کے مفاد کا تحفظ کریں۔ گویا اپنے آپ کو کانگریس میں "پانچواں کالم" ظاہر کیا کرتے تھے اور قوم پر احسان جتایا کرتے تھے کہ وہ قوم کی خاطر سب کچھ کر رہے ہیں۔ اب الہ آباد کے واقعہ نے اس فریب کا پردہ چاک کر دیا۔ ایک ہندو مسلمانوں کے مفاد کی حمایت کرتا ہے کچھ ہندو اس کا ساتھ دیتے ہیں مسلمانوں میں سے سوشلسٹ حضرات بھی تائید کرتے ہیں۔ لیکن مخالف کون ہیں۔ حضرت مولانا امام الہند ابوالکلام صاحب آزاد جناب مولانا مولوی نورالدین صاحب بہاری۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔
باقی رہے جمعیت العلمار کے دیگر حضرات۔ سو وہ منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے ہیں! کیا یہی ہے مسلمانوں کے تحفظ کا ثبوت!

یہ ہے گرگ آزمانا دوستانا کس کو کہتے ہیں؟

---

(۲) دوش بدوش

جناب آزاد صاحب کا ایک اور ارشاد بھی قابل غور ہے آج کل چین کی ایک اسلامی فیڈریشن کے ایک نمایندے ہندوستان میں آئے ہوئے ہیں۔ جناب آزاد نے ان کی وساطت سے اس فیڈریشن کے صدر کے نام ایک خط ارسال فرمایا ہے۔ جس کے آخری الفاظ یہ ہیں۔

"اسلام کی روح زندگی کے ہر شاہراہ میں۔ ایک انسان کو دوسرے کے ساتھ قدم بقدم چلنے کی تلقین کرتی ہے۔ یہ تفریق پیدا کرنا نہیں چاہتی۔ (اسٹیٹسمین ۵/۴۲-۱۵)

ذرا غور فرمائیے! زندگی کی ہر شاہراہ میں۔ اسلام انسانوں کو (بلا تمیز مذہب و ملت) دوش بدوش چلانا چاہتا ہے۔ ان میں کہیں تفریق نہیں چاہتا۔ ایک دوسرے سے الگ ہو جانے کا سبق نہیں دیتا! بجا اور درست! جب ملت حنیفہ کے موسس اول حضرت خلیل اکبر علیہ السلام اپنی قوم سے فرما رہے تھے کہ

انا برءآؤ منکم و مما تعبدون من دون اللہ کفرنا بکم و بدا بیننا و بینکم العداوۃ والبغضاء ابدا (ہم تم سے اور جن کی تم خدا کو چھوڑ کر محکومیت اختیار کر رہے ہو۔ ان سے بیزار ہیں۔ ہم تم سے بالکل الگ تھلگ ہیں (تم سے انکار کرتے ہیں) اور تمہارے اور ہمارے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بغض و عداوت ہے) تو کیا وہ اس وقت جناب آزاد کے ارشاد کے مطابق ہی (معاذاللہ) روح اسلامی کی تلقین فرما رہے تھے۔ اور جب حضور خاتم النبیینؐ کفار عرب سے علانیہ فرما رہے تھے کہ لکم دینکم ولی دین (تمہارا دین تمہارے لئے اور میرا دین میرے لئے) تو کیا وہ بھی جناب آزاد ہی کے اسلام کی (پناہ بخدا) تفسیر تھی! "زندگی کے ہر شعبہ میں۔ ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ دوش بدوش چلنا اور الگ نہ ہونا" کافر و مومن کا دوش بدوش چلنا! حرم و دیر کی راہ میں دوش بدوش چلنا! معاذاللہ معاذاللہ۔ اگر اسلام یہی ہے تو پھر کفر کسے کہا جائے گا! توڑنا صرف انہی علائق کا ناجائز ہے جنہیں جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے (ویقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل) اور جب اللہ نے کفر و اسلام حق و باطل۔ نور و ظلمت کو الگ الگ رکھنے کا حکم دیا ہے تو کس کی جرأت ہے کہ انکے دوش بدوش چلنے کا نام اسلام رکھے! لیکن اسلام بھی آج کس قدر مجبور و مظلوم ہے۔ جو جس کا جی چاہے کہدے اور اسے اسلام سے منسوب کر دے۔ کوئی پوچھنے والا ہی نہیں چونکہ جناب آزاد بتکدۂ ہند میں وطنیت کے دیوتا کی پرستش میں کفار کے ہمدوش رکوع و سجود میں محو عبودیت ہیں۔ اس لئے جناب نے یہ ارشاد فرمایا کہ اسلام کی روح یہ ہے کہ زندگی کے ہر سفر میں ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ ساتھ رہے! کیا رنگین فلسفہ حیات ہے! یاران میکدہ کو چھوڑ دینا فی الواقعہ کیش بادہ نوشی میں کفر ہے۔

---

(۳) جرم وہ نہیں یہ ہے

ہماری معاشرت میں اولاد کا خودسر اور آزاد نکل آنا بڑی مصیبت ہے اور جب کوئی لڑکی ایسی نکل آئے تو شریف آدمیوں کے لئے

وہ مصیبت قیامت ہوجاتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ آج کل کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی یہ سرکشی اور خود روی زیادہ تر اس غلط تربیت کی رہین منت ہے جسے مغرب کی کورانہ تقلید نے ہمارے گھروں میں دخل انداز کر دیا ہے۔ لیکن بہرحال اس کے نتائج ایک شریف آدمی کے لئے سوہان روح ضرور بن جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے جناب جناح کی لڑکی نے باپ کی مرضی کے خلاف ایک پارسی نوجوان سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ لڑکی نے بچپن سے اپنے پارسی ننھیال میں پرورش پائی تھی۔ باپ کو اس پر کوئی اختیار نہ تھا۔ انھوں نے اسے سمجھایا بجھایا۔ لیکن جب وہ نہ مانی تو انھوں نے اس سے قطع علائق کر لیا اور صاف صاف کہدیا کہ جاؤ میں تم سے اور تمہارے اس فیصلہ سے یکسر بیزار ہوں میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں رہیگا۔ بالکل بجا۔ شعائر اسلامی کی حرمت کے پیش نظر جتنا کچھ اختیار میں تھا۔ وہ تو کر دیا۔

تجھ پہ قابو نہیں۔ دل پہ تو ہے قابو اپنا!

اولاد کی محبت بجا اور درست۔ لیکن جو اولاد شریعت اسلامی کے خلاف چلنے کا فیصلہ کرلے۔ اس سے پھر محبت کیسی اور رشتہ کس قسم کا!

ایسا ہی واقعہ پچھلے دنوں سرحد کے ڈاکٹر خان صاحب کے پیش آیا۔ ان کی لڑکی نے فیصلہ کرلیا کہ وہ ایک غیر مسلم سے شادی کرے گی۔ باپ کی مجبوری ظاہر ہے! لیکن باپ نے کیا کیا؟ انھوں نے ایک بیان میں فرمایا۔

> میری لڑکی کے ایک ہندوستانی عیسائی فلائٹ لفٹننٹ جسونت سنگھ سے منسوب ہونے پر میرے دشمنوں کو میری مخالفت کا اچھا موقعہ مل گیا ہے اور وہ جھوٹے پراپیگنڈے سے عوام کے جذبات کو بھڑکانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں میری زندگی اور میرے اصولوں سے ہر کوئی واقف ہے میں نے ہمیشہ مطلق آزادی اور انسانی حقوق کو پامال ہونے سے بچانے کی تبلیغ کی ہے۔ میری بچی نے اپنا شریک زندگی خود اپنی مرضی سے چنا ہے اور اس لئے وہ میری دعا کی مستحق ہے اس کے انتخاب میں کسی قسم کی مداخلت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ میری یہ مداخلت خود میرے اصولوں کے خلاف ہوگی۔ میں اس کی پوری ذمہ داری اپنے سر لیتا ہوں اس بارے میں میں اس امر کی بھی توضیح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس معاملے میں میرے بھائی (عبدالغفار خاں) کا کوئی ہاتھ نہیں۔

میں کبھی اپنے لوگوں کا لیڈر نہیں بنا بلکہ بلاشبہ ان کا خادم ہی رہا ہوں۔ میں نے اپنی استعداد کے مطابق ان کی بہترین خدمات سرانجام دی ہیں لیکن اب میں محسوس کرتا ہوں کہ انھیں میری خدمات کی مزید ضرورت نہیں ہے میں انھیں خدا حافظ کہتا ہوں اور ان کی بہتری کے لئے دعا کرتا ہوں" (اسٹیٹسمین ۵/۴۲ ۱۲)

لڑکی کے فیصلہ کے لئے باپ قابلِ مواخذہ نہ تھا لیکن باپ کا جرم یہ ہے کہ وہ ایسے غیر اسلامی اقدام پر لڑکی کو خیر و برکت کی دعائیں دیتا ہے۔ اس کے نزدیک اسلامی قانون سے کھلی ہوئی سرکشی، قرآنی فیصلہ سے بغاوت، شریعت حقہ کی حرمت سے انحراف کوئی ایسا جرم نہیں جس کی بناء پر لڑکی سے علیحدگی و بیزاری اختیار کیجائے بلکہ وہ اس کے اس فیصلہ پر اسے مبارکباد پیش کرتا ہے اور اس کے اس اقدام کو درخور تحسین قرار دیتا ہے۔ اور طرفہ تماشا کہ اس کی پوری ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے۔ دو باتیں اور بھی قابلِ غور ہیں ایک تو یہ کہ جناب خاں صاحب مطلق "آزادی" کے مبلغ ہیں۔ خدا۔ رسول۔ شریعت کی حدود سے کامل آزادی! اور دوسرے یہ کہ قوانین خداوندی سے بغاوت کرنے والوں کے معاملہ میں مداخلت جناب خاں صاحب کے اصول کے منافی! گویا ان کے اصول، شریعت کے اصول سے بھی فائق ہیں۔ اللہ اکبر یہ ہے سرحد کے غیور جسور پٹھانوں کے لیڈر کا اسلام!

ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کچھ قدرت کی طرف سے ہی ایسا ہوا کہ اسلام کے متعلق جو جذبات ان حضرات کے سینوں میں چھپے ہوئے تھے ان کے اظہار کے ایسے ایسے مواقعہ بہم پہنچ گئے۔ ملّت اسلامیہ کو ان دو بھائیوں (خان عبدالغفار خاں اور ڈاکٹر خاں صاحب) نے جسقدر نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی ناممکن ہے یہ انہی کی غلط روی کا نتیجہ تھا کہ سرحد جیسا خالص اسلامی خطہ ہندوؤں کے زیر تسلط ہو گیا۔ سرحد پٹھانوں کا خطہ ہے جہاں دلائل و براہین بہت کم اثر انداز ہوتے ہیں وہاں تو جب ایک نعرہ مان لیا۔ وہ نعرہ بن گیا۔ جس ڈگر پر چل پڑے۔ چل پڑے۔ بالخصوص جب انھیں یہ بتا دیا جائے کہ گاندھی جی بہت بڑے پہنچے ہوئے "ملنگ بابا ہیں" اور تحریک آزادی اسلام کی سرفرازی کے لئے ہے اس کے بعد وہ کونسی قوت تھی جو پٹھان کو اس راہ سے بدل سکتی! قدرت نے جہاں ایک طرف مسٹر راجگوپال اچاریہ جیسے متشدد کانگریسی کو پاکستان کے صداقت کے اعتراف کے لئے کھڑا کر دیا۔ دوسری طرف سرحد میں یہ ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس کی زد پٹھانوں کی عصبیت پر براہ راست جا پڑی نتیجہ یہ کہ ڈاکٹر خاں صاحب کو سیاسیات سے مجبوراً

الگ ہونا پڑا۔ دوسرے بھائی پہلے ہی سے کچھ گوشہ نشین ہو رہے تھے۔ سو قدرت کی طرف سے اتنے بڑے مفسدہ کا کچھ اس طرح انتظام ہو گیا۔ اگر ڈاکٹر خاں صاحب کے دل میں شریعت اسلامی کا کچھ بھی پاس ہوتا تو وہ بھی جناب جناح کی طرح لڑکی سے بیزاری کا اعلان کر دیتے۔ لیکن مصیبت تو یہی ہے کہ نیشنلزم کمبخت مسلمان کو قریب قریب دہریہ بنا دیتی ہے۔ کم از کم اسلام کے ایک زندہ قوت ہونے کا ایمان تو ان کے دل میں کبھی نہیں رہتا۔ جب ان کے امام پاکستان کو غیر اسلامی تحریک قرار دیدیں تو مقتدیوں کی حمیت اسلامی معلوم ؟

بہرحال ہمیں افسوس ہوا کہ ایک مسلمان پر خدا کی محبّت کے مقابلہ میں اولاد کی محبّت غالب آ گئی اور وہ ایک خلاف شریعت اقدام کے تعاون پر مجبور ہو گیا جس سے خسر الدنیا والآخرۃ کا منظر ہر دیدۂ عبرت کے سامنے آ گیا۔

---

(۴) قول اور فعل

مسٹر راجگوپال اچاریہ کی حمایتِ پاکستان کی تحریک کیا تھی گویا انھوں نے کانگریسی بھڑوں کے چھتہ میں پتھر دے مارا۔ کائیں کائیں کرتا نوہندی سیاسیات کا طرۂ امتیاز ہے چاروں طرف سے دہائی مچا دی گئی ہے کہ لیجئو۔ دوڑیو۔ لوٹ لیا۔ مار دیا اور کوئی نہیں سنتا کہ آخر بات کیا ہوئی! کانگریس نے خود دہلی میں ایک ریزولیشن پاس کیا کہ جس علاقہ کی اکثریت ہندوستان کے مرکز کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرے گی اسے بجبر ساتھ نہیں رکھا جائے گا۔ بلکہ اسے علیحدگی کا اختیار حاصل ہوگا۔ اس کا اعادہ خود گاندھی جی اپنی تحریروں میں بھی کر چکے ہیں اور مختلف کانگریسی لیڈر کئی بار اسے اپنی تقریروں میں دہرا چکے ہیں۔ مسٹر راجگوپال اچاریہ نے الہ آباد میں اتنا ہی کہا کہ جس بات کو تم دہلی میں الفاظ کے ذریعے تسلیم کر چکے ہو اسے اب عملاً بھی تسلیم کرو۔ مسلم لیگ سے کہو کہ ہم تمہارا مطالبہ تسلیم کرتے ہیں۔ اس سے باہمی اتحاد ہو گا اور ملک کی حفاظت کا سامان ہو سکے گا۔ کیا مسٹر اچاریہ نے اس کے سوا کچھ اور بھی کہا ہے؟ اس کا جواب کیا تھا؟ ایک اور ریزولیشن جس میں یہ تصریح کر دی گئی کہ کانگریس ملک کی تقسیم کی تحریک کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتی! یعنی جب تک معاملہ لفظوں لفظوں تک تھا سب اعلان کرتے پھرتے تھے کہ ہاں! ہمیں سب کچھ تسلیم ہے۔ اور جب انہی میں سے ایک نے کہا کہ بھائی جو کہتے ہو اسے کر کے بھی دکھاؤ تو سب پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئے کہ تم کہاں سے آ گئے ایسے دیانتدار! تم

سمجھتے نہیں کہ سیاست میں کہا اور کچھ جاتا ہے اور کیا اور کچھ جاتا ہے! پنڈت جواہر لال نہرو نے حال ہی میں اپنی لاہور کی تقریر میں اس فرق کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے۔

"پنڈت جی نے صاف طور پر واضح کر دیا کہ وہ کسی شخص کو زبردستی اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے اگر کسی خاص خطہ کی اکثریت علیحدگی کا مطالبہ کرے تو اسے حق علیحدگی سے محروم نہیں کیا جا سکتا لیکن مجھ میں اور راجہ جی (مسٹر راجگوپال اچاریہ) میں ایک بہت بڑا فرق ہے اور وہ یہ کہ میں ہر ممکن کوشش کروں گا کہ ہندوستان کو تقسیم سے بچاؤں۔ (اسٹیٹسمین ۲۲/۵/۴۲)

آپنے غور فرمایا! اس بات کا اعلان کیا جاتا ہے کہ اگر کسی خطہ کی اکثریت علیحدگی کا مطالبہ کرے گی تو اسے علیحدگی کا حق حاصل ہوگا۔ لیکن راجہ جی اور پنڈت جی (یعنی کانگریس) میں فرق یہ ہے کہ راجہ جی صاحب زبان سے حق علیحدگی تسلیم کرتے ہیں تو عمل سے اس کی تصدیق بھی کر دینا چاہتے ہیں اور پنڈت جی صاف صاف اعلان فرماتے ہیں۔ کہ زبان سے اعتراف تو بجا۔ لیکن عملاً میں کوشش کروں گا کہ اس اکثریت کو اس حق سے محروم رکھا جائے۔

یہ ہے وہ سیاست جس پر مہاتمائیت کا نقاب ڈال کر دنیا کو فریب دینے کی کوشش کیجا رہی ہے اور یہ ہیں وہ سیاستداں جن کی امامت ہندوستان کی "روحِ عظیم" کر رہی ہے اور جس کی نام نہاد قیادت کا شرف جناب ابوالکلام آزاد صاحب کے حصّہ میں آیا ہے!

نوٹ۔ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر ضرور تحریر فرمایا کریں جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ بھیجئے ورنہ ہم تعمیلِ ارشاد سے معذور ہونگے۔

(منیجر)

رجسٹرڈ ایل نمبر 4240

طلوعِ اسلام کا لٹریچر

(بحوالہ "لمعات")

حسب ذیل پمفلٹ دفتر میں موجود ہیں :-

اسلامی معاشرت ۴ر - مسلمان کی زندگی ۲ر - سوراجی اسلام ۲ر - شخصیت پرستی ۲ر راشٹرپتی ابو الکلام آزاد ۲ر - جہانِ نو - یعنی پاکستانی اسکیم قرآن کریم کی روشنی میں ۴ر علم حدیث ۲ر - اسلام اور مذہبی رواداری ۲ر - واردھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان ۲ر زبان کا مسئلہ ۲ر - متحدہ قومیت اور مولٰنا حسین احمد ۲ر - خدا کی بادشاہت ۲ر شاہ ولی اللہ اور قرآن و حدیث ۲ر

محصولڈاک علاوہ (پورے سٹ پر محصولڈاک بصیغہ رجسٹری ۹ر لگتا ہے)

طلوعِ اسلام مئی ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اُس وقت سے آج تک کے تمام پرچے باستثنائے ذیل موجود ہیں۔ فی پرچہ چار آنہ۔ محصول ۱ر کے حساب سے منگائیے

جون
جولائی } ۱۹۳۸ء
اگست

جنوری ۳۹ء

مارچ ۴۰ء

ناظم

ادارۂ طلوعِ اسلام دہلی

Printed at the Jayyed Press, Delhi.
Published by Z. A. K. from Toolo-i-Islam Office Delhi.